# عرفان حق

(علامہ آئی آئی قاضی کی تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ)

مرتب:

محمد موسیٰ بھٹو

علامہ آئی آئی قاضی یادگار سوسائٹی
حیدرآباد سندھ پاکستان
۱۴۲۱ھ/۱۹۹۹ء

Marfat.com

Marfat.com

# عرفان حق

(علامہ آئی آئی قاضی کی تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ)

مرتب :
محمد موسیٰ بھٹو

علامہ آئی آئی قاضی یادگار سوسائٹی
حیدرآباد سندھ پاکستان
۱۴۲۱ھ / ۱۹۹۹ء

76663

کتاب کا نام: عرفان حق

مصنف: علامہ آئی آئی قاضی

مرتب: محمد موسیٰ بھٹو

کمپوزنگ: السند کمپوزرس کوکر محلہ حیدرآباد- فون: 785561

تعداد: ایک ہزار

قیمت: 50روپے

اشاعت سال: جولائی 1999ء

علامہ آئی آئی قاضی یادگار سوسائٹی - حیدرآباد

Marfat.com

50/-

DATA ENTERED

80-80-92

# فہرست


ابتدائیہ — ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

پیش لفظ — محمد موسیٰ بھٹو

علامہ کی شخصیت کے کچھ اہم پہلو

(۱) سورۃ اعلیٰ

چند آیات کی تشریح

(۲) راہ نجات

(۳) معلم کا کردار اور ذمہ داریاں

(۴) لازمی تعلیم

(۵) مسلمان سائنسدانوں کی ایجادات

(۶) شاہ ولی اللہ اور اخلاقیات

(۷) کردار

(۸) اقبال

(۹) شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری اور فن


1/05

# ابتدائیہ

"علامہ آئی آئی قاضی یادگار سوسائٹی" علامہ کے فکر کی اشاعت کے لئے اپنی بساط کی حد تک کوشاں ہے۔ اردو میں اس سلسلہ میں سوسائٹی کی طرف سے محمد موسیٰ بھٹو صاحب کی مرتب کردہ کتاب "مشاہدہ حق" کے نام سے شائع ہوچکی ہے، جو علمی حلقوں میں ذوق و شوق سے پڑھی گئی۔ اس سلسلے کی یہ دوسری کتاب ہے، جو"عرفان حق" کے نام سے سوسائٹی کی طرف سے شائع ہورہی ہے۔ میں محترم جناب محمد موسیٰ بھٹو صاحب کا مشکور ہوں کہ انہوں نے علامہ کی فکر کواردو کا جامہ پہنانے کے لئے نہ صرف وقت نکالا بلکہ علامہ کی فکر کواس کی گہرائیوں اور اس کی اصل روح کے ساتھ پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ نیز اس کام کو انہوں نے اپنا سمجھ کر کیا۔ انہوں نے علامہ کی فکر کے پس منظر اور پیش منظر پر ایک مبسوط مقالہ بھی لکھا۔

جدید دور میں ہماری نوخیز نسلوں کو انسان اور کائنات کی حقیقت اور پاکیزہ قدروں کے حوالہ سے ایک ایسی فکر کی ضرورت ہے، جوان کے ذہنی اشکالات کے ساتھ ساتھ ان کے وجدان کے تقاضوں کو بھی پورا کرسکے اور جس میں خود اعتمادی اور یقین کی قوت بھی موجود ہو اور جس میں جدید وقدیم فلاسفروں کے فکر کی خوشہ چینی کی بجائے ایماں و یقین کی بنا پر جدید اسلوب اور جدید انداز موجود ہو۔ علامہ آئی آئی قاضی کی فکر میں یہ ساری خوبیاں اور کمالات موجود ہیں، جیساکہ زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے، پڑھنے والے کادل ازخود اس کی گواہی دے گا۔

"عرفان حق" کے بعد سوسائٹی کی جانب سے انشاء اللہ علامہ کے فکر پر مشتمل تیسری کتاب بھی شائع کی جائے گی۔

نبی بخش
سیکریٹری جنرل
علامہ آئی آئی قاضی یادگار سوسائٹی

سندھ یونیورسٹی
حیدرآباد
6جون 1999ع

Marfat.com

۵

# پیش لفظ

فرد، معاشرے اور ریاست کی تعمیر و تشکیل کے مسائل ایسے بنیادی موضوعات ہیں، جو ہمیشہ انسانی فکر و فلسفہ کا موضوع بحث رہے ہیں۔ حکماء اور فلاسفروں کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ انسانوں کی رہنمائی کیلئے ان مسائل پر حکیمانہ انداز سے بحث کرتے ہیں، وہ فلاسفر اور حکماء جو نور نبوت سے فیض اخذ کرتے ہیں، وہ جب ان مسائل پر بحث کرتے ہیں تو ایک طرف تو وہ فلسفہ میں ایسا رنگ بھر دیتے ہیں کہ ان کی وہ فلسفیانہ گفتگو اور تحریر انسانی کلام کی شاہکار حیثیت اختیار کرنے لگتی ہے اور اہل علم اور دانشوران کی وہ تحریر پڑھکر اپنے ذہن کو جلا دینے لگتے ہیں۔ دوسری طرف ان میں فرد معاشرے اور ریاست کے مسائل کے سلسلے میں ایسا متوازن فکر موجود ہوتا ہے کہ افرادِ معاشرہ کج بحثوں میں پڑنے اور غلط سمت میں سفر کرنے کی بجائے صاف شاہراہ پر گامزن ہونے لگتے ہیں۔ جب کسی قوم کو اس طرح کے حکماء اور فلاسفر مل جاتے ہیں تو وہ قوم دنیا کی سب سے زیادہ خوش قسمت شمار ہونے لگتی ہے۔ عروج و ترقی اور کامیابی اس کا مقدر ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے فلاسفروں سے محرومی یا ان کی بے قدری کے نتیجہ میں قومیں ذلت و مسکنت سے دوچار ہونے لگتی ہیں اور دنیا کی قوموں کے لئے وہ عبرت کا موجب بن جاتی ہیں۔

برصغیر ہند میں پچھلے سو سال میں فکر و نظر اور علم و دانش اور میدان فلسفہ میں جن حکماء و فلاسفروں نے دنیا بھر کے فلاسفروں کے مختلف علوم کے اماموں اور ماہروں کے وسیع مطالعے اور مذاہب کے تقابلے جائزے کے بعد اپنی فکر پیش کی ہے، ان میں علامہ اقبال، علامہ آئی آئی قاضی اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب ممتاز حیثیت کے حامل ہیں، بلکہ یہ شخصیتیں ہمارے لئے سرمایہ حیات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان تینوں حکماء نے اپنے فکر و فلسفہ میں دنیا بھر کے علوم کے حوالے سے ہمارے لئے انفرادی و اجتماعی زندگی کیلئے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا ہے، جو افراد، معاشرے اور ریاست کے لئے متوازن لائحہ عمل ہے، جس پر چل کر ہم دنیا کی قوموں کے لئے ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے فلسفہ کو خودی کا نام دیا ہے، یعنی خود شناسی، اسی طرح ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا فلسفہ محبت کے مرکزی نصب العین کے گرد گھومتا ہے۔ علامہ آئی آئی

Marfat.com

قاضی کے فکر و فسلفہ کا محور شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہے۔ دور جدید کے یہ تینوں فلاسفر اپنے سارے علوم کا نچوڑ اور مذاہب کے اپنے تقابلی مطالعہ کا حاصل اور نور نبوت سے ماخوذ فیض کی روح خود شناسی، محبت و معرفت اور تعمیر سیرت کو قرار دیتے ہیں، جو ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں اور ایک ہی نصب العین کے اظہار کے مختلف طریقے ہیں۔

چونکہ ہمیں یہاں علامہ آئی آئی قاضی کے فکر کے حوالے سے گفتگو کرنی ہے، اس لئے ہم اپنی بحث کو انہی تک محدود کرتے ہیں۔

علامہ آئی آئی قاضی کی فکر میں ایک ممتاز فلسفی کی حیثیت سے سیاست، معیشت، معاشرت، خاندان، افکار، نظریات اور دنیا بھر کے علوم کے بارے میں بہت ساری قیمتی معلومات اور نکات موجود ہیں۔ لیکن ان کا فکر جس مرکزی نصب العین کے گرد گھومتا ہے اور وہ جس فکر کو مقصدی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ معاشرے اور ریاست کی ساری تشکیل کا انحصار فرد کی سیرت و کردار کی تعمیر و تشکیل پر ہے اور فرد کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے پر ہے، ان کا کہنا ہے کہ قدرت کی طرف سے ہر فرد میں اس طرح کی جوہری صلاحیتیں رکھی گئی ہیں کہ اگر ان صلاحیتوں کو جلادی جائے اور ان کی نشوونما کی جائے تو فرد معاشرہ اور ریاست خیر، بھلائی اور انسانی جوہر سے عبارت ہوسکتا ہے اور انسانی اوصاف کے کمال و عروج کا مظہر ہوسکتا ہے۔ اس لئے ریاست کیلئے اس طرح کا نظام تعلیم و تربیت ترتیب دینا ضروری ہے، جس سے افراد کی خوابیدہ باطنی صلاحیتیں بیدار ہوں اور ان کا رشتہ خیر کی طاقتوں سے مضبوط بنیادوں پر استوار ہو، تاکہ وہ شر و شیطنت اور حیوانیت کی طاقتوں پر فتح حاصل کر کے معراج انسانیت کے ارفع مقام پر پہنچ سکیں۔

علامہ کا کہنا ہے کہ پاکیزہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ افراد جب اپنی فطرت سے آشنا ہونے لگتے ہیں تو ان کا خیر کی ابدی قوتوں سے رشتہ اتنا مستحکم ہوجاتا ہے کہ خیر، صداقت اور کردار کی بلندی اور انسانیت نوازی کے نئے نئے بلند مقامات ان کے لئے وا ہونے لگتے ہیں، اس طرح وہ معاشرے اور ریاست کے لئے ارتقاء کا ذریعہ بننے لگتے ہیں۔ لیکن اگر معاشرہ اور ریاست اور اس کے سارے ادارے فرد و افراد کی داخلی تربیت اور کردار کی تشکیل سے غافل و بے نیاز ہوجائیں تو پھر ریاست میں وہ افراتفری پھیل جاتی ہے کہ اس کا ہر ادارہ ٹوٹ پھوٹ اور انجام بد سے دوچار ہونے لگتا ہے۔ انسانیت رخصت ہونے لگتی ہے۔ حیوانیت

Marfat.com

اور بہیمت کے مظاہرے عام ہونے لگتے ہیں۔ معاشرہ انسان بیزاری، سنگینی، دولت سے محبت، مادی حسن سے فریفتگی اور جرائم کی دلدل میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ اس سے نکلنے کی ساری راہیں بند ہوجاتی ہیں۔ حالت این جا بر سید کہ ریاست کے جملہ عہدوں اور کلیدوں شعبوں پر ایسے افراد فائز ہوجاتے ہیں، جو انسانیت کے جوہر سے محرومی کی وجہ سے دولت، عہدوں، مادی حسن سے دل بہلانے کی خاطر جملہ قومی وسیلوں کو اپنی ذات کیلئے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ قانون، اخلاق اور انسانیت کی کوئی آہنگ ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ چنانچہ معاشرہ کی نچلی سطح پر جرائم پیشہ افراد قاتل، چور، ڈاکو لٹیرے وغیرہ معاشرہ کو تباہ کرنے میں جو کردار ادا کرتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ ریاست کے کلیدی عہدوں پر فائز افراد حبِ جاہ و حبِ مال کے جذبات سے مغلوب ہوکر ریاست کی دولت، املاک اور اجتماعی قومی مفادات کے خلاف اس طرح کا کردار ادا کرتے ہیں۔

علامہ معاشرے اور ریاست کو ہر قسم کی ابتری سے بچانے کیلئے سیرت و کردار کی تعمیر کے اجتماعی نظام کو ناگزیر قرار دیتے ہیں، جو افراد کی مہذب طور پر تربیت کر سکے، ان کی نظر میں انسانیت کا جملہ خیر اور افراد معاشرہ اور ریاست کی ساری ارتقا اسی نظامِ تربیت سے وابستہ ہے، وہ زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ آپ مجھے افراد سازی کا پاکیزہ نظام تعلیم و تربیت دیں، میں آپ کو اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور فوجی اعتبار سے طاقتور اور مضبوط ریاست کی ضمانت دیتا ہوں ایسی ریاست، جو دنیا کیلئے ہر اعتبار سے ماڈل ثابت ہوسکے، جسے دیکھکر دنیا کی نام نہاد مہذب قومیں اس ریاست کے خیر اور اس کی پاکیزہ تہذیب کو اپنانے کے لئے مضطرب و حریص ہوکر لپکیں۔

ہمارے اس دور میں انسانیت کے ساتھ ایک بہت بڑا المیہ جو ہوا ہے، جس نے اس کی چولیں ہلادی ہیں، وہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ قوموں نے تمدن اور ریاست کی بنیاد بے خدا نظریے اور عقل اور محض عقل پر رکھی ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی سے خدا، مذہب، دین اور انسانیت کے ہزارہا سالہ مسلمہ بنیادی اعتقادی نظریات اور تہذیبی روایات کو مسترد کرتے ہوئے اس کی تشکیل خالص مادہ پرست بنیادوں پر کی ہے۔ نیز ریاست کے تمام اداروں اور سائنس اور سارے سائنسی علوم اور تحقیق کو مکمل طور پر خالق کائنات اور تخلیق کائنات کے بنیادی مقصد کے منافی مقصد کے لئے استعمال کرنا شروع کیا ہے اور

Marfat.com

عالمی سطح پر ایسی تہذیب کی نمود کی ہے، جس کے اجزاء خالص مادیت، ما بعد الطبعیاتی حقائق سے انکار، فطرت انسانی سے ہم آہنگ مقاصد سے اعراض بلکہ اس کی تکذیب' زندگی کے مادی نقطہ نگاہ ہی کو زندگی کا نصب العین سمجھنا اور اس نصب العین کی خدمت کیلئے علوم وفنون اور سارے ریاستی اور ابلاغی ذرائع کو استعمال کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ اس دور کا وہ سب سے بڑا المیہ ہے، جو انسان کے ساتھ ہوا ہے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ انسانیت نے شعوری طور پر تمام علوم وفنون کو انسانیت کی حیوانیت، بہیمت اور بہیمانہ حیثیت کو طاقتور بنانے اور اس کی انسانی حیثیت کو کمزور کرنے کیلئے استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ اور اسے ریاست کے مقاصد میں شمار کرلیا ہے۔ بے خدا تہذیب کے عالمی علمبرداروں کی کوششوں کے نتیجہ میں سارے ملکوں اور ساری قوموں میں علوم وفنون اور ترقی، سائنس کے حوالے سے یہ مادی تہذیب اور مادی نظریات کے یہ اثرات پہنچ گئے ہیں اور مسلم ممالک کی آبادی کا قابل ذکر طبقہ بری طرح مغربی تہذیب کے ان اثرات کی زد میں ہے، ان حالات میں مسلم دنیا کے جن حکماء اور فضلاء نے تہذیب جدید کے فلاسفروں کے مابعد الطبعیاتی حقائق سے انکار اور مادی نظریات کا وسیع مطالعہ کر کے ان کے اسلوب، ان کے استدلال، ان کے انداز فکر اور ان کی پیشکش کے سائنٹفک طریقہ کار سے استفادہ کر کے اسلامی فکر و فلسفے اور نظریے کو انہی کے انداز فکر اور اسلوب میں پیش کرنے کی عظیم خدمت سرانجام دی ہے، ان حکماء میں علامہ آئی آئی قاضی کا نام سرفہرست ہے، علامہ تیس سال تک یورپ میں رہے، وہاں انہیں اس فکر اور اس فکر کے حامل دانشوروں اور عام لوگوں کو طویل عرصے تک قریب سے دیکھنے اور انہیں سمجھنے اور ان کی ذہنی وعلمی سطح کے مطابق ان کے سامنے اسلامی دعوت اور اسلامی فکر کی تشریح کرنے کا موقعہ ملا، اس سلسلے میں علامہ کا کام اتنا اہم ہے کہ اسلامی دنیا میں بہت کم مفکر اور حکیم ایسے ہیں، جن کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ انہوں نے جدید تعلیم یافتہ آبادی کے سامنے ان کی اپنی زبان اور ان کی اپنی ذہنی سطح کے مطابق ان کے سامنے اس حکیمانہ انداز سے اسلامی فکر اور اسلامی دعوت پیش کی ہے کہ جدید اسلوب کے حامل افراد کے عقل مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

علامہ کی پیشکش اور اسلوب بیان کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ساری تقریر اور گفتگو میں واعظ اور ناصح ہونے کا تاثر نہیں دیتے، لیکن ان کی ہر تقریر کے حقائق، واقعات

اور گفتگو سے ذہن میں جو تاثر قوی ہوتا ہے وہ اسلامی فکر و فلسفہ پر صداقت کا تاثر ہے۔ ان کی پیشکش کی دوسری خاصیت یہ ہے کہ وہ بے خدا تہذیب کے علمبرداروں اور مادی نقطۂ نگاہ کے حامل فلاسفروں کے اپنے دلائل اور ان کی اپنی فکر اور اپنی تحقیق سے خالق کائنات اور اس کے آخری پیغام کی صداقت اور اس کا اثبات پیش کرتے ہیں۔

علامہ کی تقریروں کی تیسری خاصیت یہ ہے کہ فلسفیانہ رنگ میں ہونے کے باوجود وہ عام فہم ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے فلسفہ کو جدید عام فہم صورت دی ہے اور اس فلسفہ کے ذریعہ خدمتِ اسلام کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

علامہ کے فکر کی ایک بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ بنیادی اسلامی فکر اور اسلامی فکر کے اساسی معاملات میں اسلاف کی فکر سے ہم آہنگ فکر پیش کرتے ہیں اور اس معاملہ میں وہ جدید دور کے متعدد اہم مفکروں کی روش سے ہٹ کر ایسا متوازن طرز فکر اختیار کرتے ہیں، جو قابل تعریف ہے اور جس سے اسلاف کی فکر سے ہٹ کر اسلامی فکر کی نئی تشریح و تعبیر (جس سے ملت میں تفریق اور گروہی دائروں کا خطرہ پیدا ہو) کا امکان پیدا نہ ہو۔

علامہ آئی آئی قاضی کے فکر کا مرکزی نکتہ جیسا شروع میں عرض کیا گیا، فرد کی اصلاح اور اس کی سیرت و کردار کی تعمیر و تشکیل ہے۔ علامہ اسلام کو انسانیت کا آخری دین اور مذاہب کے ارتقاء کی آخری کڑی قرار دیتے ہیں اور انسانیت کے جملہ مسائل کا حل اسلام کو قرار دیتے ہیں، وہ مذاہب کے وسیع تقابلی مطالعے، انسانیت کی تاریخ کے گہرے مشاہدے اور جدید و قدیم فلاسفروں کے وسیع مطالعے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسانیت کی رہنمائی کے لئے اللہ کو جو جامع اور کامل دین بھیجنا تھا، اس میں انسانیت کی ساری جملہ ضروریات موجود ہیں، نیز یہ دین عقل سلیم اور فطرت سلیمہ سے اس طرح مطابقت رکھتا ہے کہ سلیم فطرت اور سلیم عقل کا حامل انسان اسلامی تعلیمات اور اسلامی قوانین کو دیکھ کر عش عش کر اٹھتا ہے اور وہ انسانیت پر قدرت کی آخری وحی میں اعتدال و توازن و حکیمانہ قوانین پر وجدان کی گہرائیوں سے اس کے در پر سجدہ ریز ہوتا ہے۔ علامہ کی فکر میں فرد کی تعمیر و تشکیل پر زور اس لئے زیادہ ہے کہ جدید انسان کائنات کی تسخیر اور عقلی اور ذہنی قوتوں کے استعمال کے اعتبار سے تاریخ کے اس موڑ پر پہنچ چکا ہے کہ وہ اگر نظریہ توحید اور اسلامی تعلیمات سے آشنا ہو جائے اور اس کی سیرت و کردار کی تعمیر ہو جائے۔ نیز اسے معرفت نفس

Marfat.com

حاصل ہوجائے تو اس کی زندگی از خود اسلامی مقاصد سے ہم آہنگ ہوجائے گی۔ اس لئے کہ جدید طبعی علوم و فنون، سائنسی تحقیقات اور میدان سیاست و معیشت میں انسانی تجربات نے قدرت کے ایسے ہزارہا راز واشگاف کر دیئے ہیں کہ توحید و رسالت پر یقین اور تعمیر سیرت کے نتیجہ میں اجتماعی انسانی زندگی از خود ہدایت الٰہی اور اسلامی قوانین کے راستے پر گامزن ہوجائے گی اور اس معاملہ میں اسے بہت زیادہ دشواری نہ ہوگی۔ اس لئے کہ اب تک ساری انسانی تحقیق قدرت، قدرت کے قوانین اور اسلامی تعلیمات کی صداقت کی شہادت دے رہے ہیں، عقل و وجدان پر توحید کے انکار اور نفس پرستی کی وجہ سے جو پردے پڑ گئے ہیں، جب یہ پردے دور ہوں گے اور افراد اپنی حقیقت اور اپنی داخلی قوتوں سے آشنا ہوں گے تو یہ قوتیں انہیں اسلامی قوانین کی بالادستی و برتری کے راستے پر مجبور کریں گی، اس پس منظر میں معرفت نفس اور داخل کی اصلاح کے حوالے سے علامہ کی فکر میں مبالغے کی حد تک زور بہت معنیٰ خیز ہے اور وہ انشاءاللہ مستقبل میں اجتماعی زندگی میں حیرت انگیز انقلابی تبدیلی اور پاکیزہ عالمی تہذیب کی نشوونما کے لئے اساسی اہمیت کا حامل ثابت ہوگا۔

علامہ آئی آئی قاضی قوموں کی زندگی، ترقی اور بقا کے بارے میں ایک اہم نکتہ بیان کرتے ہیں، جو قابل غور ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فرد کی موت اس کے جسمانی نظام میں موجود وحدت اور باہمی رابطہ کے منقطع ہونے اور ایک دوسرے کو ملانے والی اصل قوت کے رخصت ہونے کے نتیجہ میں واقع ہوتی ہے۔ جب فرد کا داخلی نظام جو ایک دوسرے کو جوڑنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے، وہ باقی نہیں رہتا تو موت واقع ہوجاتی ہے۔ اگرچہ انسان کا جسم موجود ہوتا ہے، لیکن جسم میں وحدت پیدا کرنے والی قوت کی جدائی کی وجہ سے وہ جسم لاش کی صورت اختیار کر جاتا ہے، اگر اس لاش کو دفن کرنے میں تاخیر کی جائے گی تو بدبو پیدا ہوگی، علامہ کا کہنا ہے کہ قوم کے اجتماعی نظام کی مثال بھی فرد کے جسمانی نظام کی طرح ہے، قوم کی اجتماعی وحدت کو برقرار رکھنے والی قوت باہمی محبت اور الفت کی وہ فضا ہے جو قوم کے افراد کے درمیان اجتماعی زندگی میں موجود اور قائم رہتی ہے۔ لیکن جب قوم کے افراد سے اجتماعیت کی وہ روح فنا ہوجاتی ہے، قومی مفاد کی جگہ ذاتی مفاد لے لیتا ہے اور قومی و ملی جذبات افراد میں تحرک و تحریک پیدا کرنے میں ناکام ہوجاتے ہیں تو پھر ایسی قوم

قومی اجزاء کو ساتھ رکھنے والی قوت اور روح سے محروم ہوجاتی ہے، اس صورت میں موت اس کا مقدر ہوجاتا ہے اور اس کی بقا اور زندگی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی، جس طرح مردہ انسان کی لاش کو دفن کرنا پڑتا ہے، اسی طرح قدرت کے قانون کے عین مطابق ایک اتحاد، الفت اور محبت کی فضا اور روح کے خاتمہ کے بعد اس طرح کی قوم کو فنا کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے یا غلامی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کیلئے علامہ کا یہ نکتہ ہمارے غور و فکر کے لئے اس لئے اہم ہے کہ ہم عملاً اس طرح کی صورتحال سے دوچار ہیں۔

علامہ انسانیت اور حیوانیت کے درمیان فرق کی توضیح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حیوانوں (کتوں اور بندروں) کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ہڈیوں کی فکر میں رہتے ہیں اور ہڈیوں کے لئے باہم لڑتے رہتے ہیں، جبکہ انسانوں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ارفع مقاصد اور پاکیزہ نصب العین کیلئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کیلئے کوشاں رہتے ہیں۔ لیکن جب حیوانوں اور انسانوں کے مقاصد یکساں ہوجائیں، انسان بھی دنیا کی ہڈیوں کی چھینا جھپٹی کو زندگی کا معراج سمجھنے لگے، دولت کی خاطر حیوانوں جیسی ذلیل حرکتیں کرنے لگیں تو ظاہر ہے دونوں کی سطح یکساں ہوجاتی ہے اور ان کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ یہ چیز انسانیت کیلئے توہین کے مترادف ہے۔ انسانیت کی یہ توہین انسان کے اپنے ہاتھوں ہورہی ہے اور انسان اپنے کردار سے خود ثابت کررہا ہے کہ اسے انسانیت کی سطح، انسانیت کی پاکیزہ اور جوہری زندگی زیبا نہیں، وہ حیوانیت پر ہی قانع ہونا چاہتا ہے اور حیوانی زندگی ہی کو پسند کرتا ہے۔ کھانے پینے اور لذت کے علاوہ زندگی میں اس کا دوسرا کوئی مقصد نہیں۔ اس موضوع پر علامہ کی گفتگو تاثر، درد اور جذبات سے بھری ہوئی اور نہایت فکر انگیز ہے۔

علامہ نے ایک بار کہا تھا کہ انہوں نے قرآن شریف کو سمجھنے کے لئے عربی زبان سیکھی، مولانا رومی اور حافظ کو سمجھنے کے لئے فارسی زبان سیکھی اور گوئٹے کے کلام سے متعارف ہونے کے لئے جرمنی سیکھی۔ اس سے علامہ کے شوق، جستجو اور کاوش و جہد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مختلف علوم کے حصول کے لئے انہوں نے مختلف اہم زبانوں میں صلاحیت و مہارت پیدا کرنے کے لئے وقت صرف کیا۔

علامہ موصوف کو اس بات کی بھی فکر دامنگیر تھی کہ کاش کہ ذہین لوگوں اور جدید

علوم کے حامل افراد میں کچھ ایسے افراد سامنے آئیں جو اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر میری صحبت میں رہیں تاکہ میں ان کی تربیت کروں اور فلسفیانہ اسلوب و انداز کے ساتھ ساتھ ان کے اندر وہ وجدانی کیفیات بھی منتقل کروں، جن کی بدولت وہ اسلامی فکر کی آہنگ پوری قوت اور یقین کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کریں اور میرے بعد میری فکر کو میری طرح پیش کرتے رہیں۔ اس سلسلہ میں علامہ نے زندگی بھر مختلف افراد پر محنتیں کیں، اس سلسلہ میں جناب اے کے بروھی سے بھی انہیں بڑی توقعات وابستہ تھی، لیکن اے کے بروھی موصوف بھی علامہ کی توقعات کے مطابق وقت نہ نکال سکے، تاہم علامہ کی فکر اور وجدانی قوتوں کے کچھ اجزاء محترم بروھی صاحب میں منتقل ہوئے۔ ایک تقریر میں علامہ نے اس آرزو کا اظہار کیا تھا کہ میں زندگی بھر مشرق سے مغرب تک یہ آوازہ دیتا رہا کہ ہے کوئی ایسا دانشور یا اہل علم جو وقت دینے کے لئے تیار ہو اور جس میں یہ جذبہ و شوق موجود ہو کہ وہ فکر و نظر، علم و فضل اور نور نبوت کے حوالے سے انسانی خدمت کا عظیم فریضہ سرانجام دینا چاہتا ہو، لیکن افسوس ہے ایک فرد بھی سامنے نہیں آیا اور میری آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

زیر نظر کتاب علامہ کی تقاریر کا دوسرا مجموعہ ہے، اس سے پہلے "مشاہدہ حق" کے نام سے علامہ کی تقاریر پر مشتمل کتاب چھپ چکی ہے۔ زیر نظر کتاب کے ترجمہ میں مجھے برادر محترم سعید احمد بھٹو صاحب کا غیر معمولی تعاون حاصل رہا۔ ان کے تعاون کے بغیر اس کتاب کی تیاری مشکل تھی، اس تعاون کے لئے میں دل کی گہرائیوں سے ان کے لئے دعاگو ہوں۔ میں علامہ آئی آئی قاضی یادگار سوسائٹی کے سیکریٹری محترم جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کے اردو ترجمہ کے لئے مجھ پر اعتبار کیا۔

زیر نظر کتاب میں بعض مضامین عبدالغفار سومرو صاحب کی علامہ کی تقاریر و تحریروں کے سندھی ترجمہ پر مشتمل کتاب "صوفی لاکوفی" سے ماخوذ ہیں۔ اس اجازت کے لئے ہم عبدالغفار سومرو صاحب کے ممنون ہیں۔ موصوف ویسے بھی سندھ کے ان دانشوروں میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں جو اسلامی فکر سے محبت رکھتے ہیں، وہ فلسفیانہ ذہن کے حامل ہیں اور تصوف کے مزاج سے رچے بسے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز عمرانی صاحب ہم سب کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں کہ

Marfat.com

انہوں نے علامہ آئی آئی قاضی کی کیسٹ شدہ انگریزی تقاریر سے سندھی زبان میں ترجمہ کا کام شروع کیا اور ماہانہ "بیداری" میں تراجم کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ہماری درخواست پر انہوں نے پانچ سال پہلے یہ مشکل کام ہاتھ میں لیا، اب وہ علامہ کی بیسیوں تقاریر کیسٹ کے ذریعہ سندھی میں ترجمہ کر چکے ہیں، ان کی یہ خدمت ہر اعتبار سے قابل تحسین اور لائق تعریف ہے۔ اس اعتبار سے علامہ کی فکر کو متعارف کرانے میں ان کا کردار اہم ہے۔

محمد موسیٰ بھٹو

حیدر آباد

Marfat.com

# علامہ آئی آئی قاضی کی شخصیت کے چند اہم پہلو

ذیل میں مرحوم قاضی فیض محمد آف ہالانی کی کتاب "علامہ آئی آئی قاضی" کے چند اقتباسات پیش کر رہے ہیں، یہ اقتباسات علامہ کی زندگی اور کردار کے اہم پہلوؤں کو واضح کرنے میں مدد و معاون ہوں گے۔

(سندھ یونیورسٹی کی) سینٹ کا انتخاب ہوا تو مجھے بن بلایا میمبر منتخب کرلیا گیا۔ اجلاسوں میں شرکت شروع ہوئی تو ہم نے قاضی صاحب سے گذارش کی کہ چونکہ آپ کی تنخواہ "خاطر خواہ" نہیں ہے، بنا بر ایں ماہانہ ایک ہزار روپے کا اضافہ کیئے دیتے ہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ جو مل رہا ہے، وہی کافی ہے، اگر زیادہ مجبور کرو گے تو مستعفی ہو جاؤں گا۔ بالاخر ہمیں شکست کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ہم بھی کچھ کم نہ تھے، ایک نئی ترکیب نکال کر بزعم خویش خردمند بننے لگے۔ ہوا یوں کہ محترم قاضی صاحب اور مسز قاضی سندھ یونیورسٹی کے لئے سائنسی اوزاروں کی خریداری کی خاطر لندن گئے تھے، اوزار بھی بیحد اونچے بھاؤ والے تھے، اوپر ذکر کی گئی ترکیب کے مطابق طے ہوا کہ برطانیہ کے دورے کے جو اخراجات (بسلسلہ خریداری سامان) آئے ہیں، ان کی ادائیگی کر کے قاضی صاحب کو "خود کفیل" بنانے کی جسارت کی جائے۔ یہ بات جب قاضی صاحب کے کانوں میں پڑی تو نہایت سلیقے سے کہلوا بھیجا کہ: "بھئی! ہماری خواہش تھی کہ دوچار روز یورپ کی سیر کیلئے نکالے جائیں، جو خواہش تھی وہ پوری ہوئی، اگر اس دوران میں جامعہ کی خدمت کی کوئی سبیل نکلی ہے تو یہ سعادت کی بات ہے، البتہ اخراجاتِ سفر کی وصولی ہمارے لئے زیبا نہیں!"

محترم نانا صاحب، جن کی رفاقت میں مجھے بھی ملازمت کرنے کا موقعہ ملا تھا، "نانا صاحب" جامعہ سندھ کی مجلس منتظمہ کے ناظم اعلیٰ تھے اور میں ان کا نائب! نانا صاحب بھی سینیٹ کے میمبر ہوا کرتے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نے ہزارہا روپے وصول کرنے سے انکار کردیا ہے تو نانا نے غائبانہ طور پر چیک وصول کر کے علامہ صاحب کے اکاؤنٹ میں جمع کرادیا۔ قاضی صاحب نے جب اپنا اکاؤنٹ دیکھا تو رقم کے غیر معمولی اضافے پر حیران ہو کر رہ گئے، تحقیق کی، جب انہیں صحیح صورتحال معلوم ہوئی تو چیک

Marfat.com

کاٹ کر رقم نکلوائی اور فوراً جامعہ کے اکاؤنٹ میں جمع کرادی۔ قاضی صاحب نے سرکاری موٹر گاڑی رکھنے کی بھی ضرور محسوس نہیں کی۔ وکٹوریہ گاڑی ماہانہ کرائے پر انہیں گھر سے جامعہ تک لانے اور لے جانے پر مامور تھی۔ یہ کرایہ وہ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ ان کی زندگی یورپ کی تن آسانی والی سوسائٹی میں بسر ہوئی تھی، جبکہ اماں ایلسا کا تو وطن ہی "جرمنی" تھا۔ لیکن سادگی کی انتہا یہ تھی کہ کپڑوں کو پیوند لگے ہوتے تھے اور پرانے کپڑے زیب تن کرتے ہوئے انہیں آزردگی کی جگہ اطمینان ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ ان کی زیارت کے شرف سے مشرف ہونے کی سعادت ملی تو کیا دیکھتا ہوں کہ قاضی صاحب آزردگی اور ملال کی کیفیت کا مجسمہ بنے ہوئے ہیں۔ میرے وجدان نے محسوس کیا کہ جامعہ سندھ سے علیحدگی کے بعد علامہ کے مالی حالات صحیح نہیں ہیں، اس لئے ان کی مالی مدد کی جائے، چنانچہ نواب شاہ پہنچتے ہی میں نے چند سو روپے کا چیک ارسال کردیا۔ قاضی صاحب نے چیک واپس کردیا، ساتھ ہی ایک خط بھی لکھا کہ "چیک ارسال کرنے والا غریب ہے اور ہمیں اللہ کے فضل سے نان شبینہ دستیاب ہے"۔ مجھے دل کی بیقراری نے اے کے بروھی صاحب کے ہاں پہنچادیا، میں نے بروہی صاحب کو حالِ دل سنایا۔ بروھی نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں لاکھوں کماؤں اور قاضی صاحب مشکل میں ہوں؟ (واضح رہے کہ علامہ نے بروھی صاحب کو اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا) ان کے رویے سے میری ڈھارس بندھی، بعد میں پتہ چلا کہ بروھی صاحب نے بھی نئی ترکیب نکال کر اپنے روحانی باپ کی مشکل آسان کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہوا یوں کہ بروھی صاحب نے ان ہی دنوں اپنی بچی کی شادی کی تھی، قاضی صاحب کو فون کیا کہ میں بچی کے نکاح کے فرض سے سبکدوش ہوچکا ہوں، بنا بریں بچی اور داماد سمیت دعاؤں کیلئے حاضری مطلوب ہے۔ قاضی صاحب نے حسب دستور چائے، کیک، پیسٹری وغیرہ سے اپنے عزیزوں کی "آؤ بھگت" کی تیاری کرلی، جب بروھی صاحب قدم بوسی کیلئے آئے تو ساتھ میں ایک سونے کا قیمتی سیٹ بھی ساتھ لائے۔ اسے ہدیتاً علامہ کی خدمت میں پیش کیا۔ مٹھاس کا مجسمہ بنی ہوئی اماں ایلسا نے جو سونے کا سیٹ دیکھا تو بے چین ہوگئیں. کہنے لگیں: "بروھی صاحب! آپ ہمارے ساتھ اتنا عرصہ رہے ہیں. لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ اب تک ہمیں سمجھ نہیں سکے ہیں۔" اماں ایلسا کو ناراض دیکھ کر قاضی صاحب نے انہیں مخاطب کر کے کہا: "ناراض نہ

Marfat.com

ہوجئے ڈیئر! بروھی صاحب سے تحفہ لیجئے!!! اس وقت تو قاضی صاحب نے بروھی صاحب کی تالیف قلب کیلئے تحفہ لے لیا، لیکن بعد میں مسٹر حمزہ خان قریشی (جو بعد میں ہائیکورٹ کے جج بھی رہے ہیں) کے ہاتھوں سیٹ بروھی صاحب کو بھجوادیا۔ ساتھ لکھا کہ: "ہمارے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہم اللہ کی دربار میں حاضر ہوں تو ہمارے گھر میں سونے کے سیٹ موجود ہوں۔" قاضی صاحب مجھے بعض اوقات میری تربیت کی خاطر بعض رازدارانہ باتوں میں بھی شریک کرلیتے تھے، فرماتے: "بیٹے! یہ باتیں بتانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ دوسروں تک پہنچائیں!" میں نے زندگی میں کبھی بھی تہمند کے بغیر غسل نہیں کیا۔"
حضور شرمی کی حد یہ تھی کہ وصیت کی ہوئی تھی کہ بعد از مرگ کپڑے اتارے بغیر غُسل دیں۔

ایک مرتبہ فرمانے لگے "بیٹے! وہ دن بھی کتنے حسین دن تھے، ہم ساتھی آپس میں شرطیں لگاتے تھے کہ پاکدامنی میں کون کس منزل پر ہے؟ ہماری جوانی کے زمانے کی بات ہے، ایک مرتبہ ہمارے عزیز نوجوان کا امتحان مطلوب تھا، اندازہ یہ کرنا تھا کہ اسے اپنے نفس پر کس قدر کنٹرول ہے؟ ایک لڑکی جس کا غریب گھرانے سے تعلق تھا، اس کی چارپائی موصوف کے بستر کے قریب بچھائی گئی، دو راتیں تو خیر سے بسر ہوئیں، البتہ تیسری رات کی درمیانی شب کا وقت ہوگا، کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے عزیز صاحب تیزی سے چارپائی سے کود کر باہر آئے اور آہ و بکا کرنے لگے اور کہنے لگے کہ نفسی وسوسوں نے مجھے ہلاکت کے قریب پہنچادیا تھا! حالانکہ ان بچاروں سے عملاً کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی تھی۔ صرف خیالات کی آمد ہونے لگی تھی۔ اس واقعہ کا ان صاحب پر یہ اثر ہوا کہ وہ اندر سے ہل کر رہ گئے اور اسی پیچ و تاب اور احساسات کی شدت میں چند ماہ کے اندر اندر انتقال کر گئے۔

Marfat.com

# سورۃ اعلیٰ

## چند آیات کی تشریح

علامہ صاحب نے یہ تقریر 21 دسمبر 1952ء میں سندھ یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں ارشاد فرمائی۔ یونیورسٹی میں ان کی آمد کا یہ ابتدائی دور تھا، جس کی بنا پر شاید توسیعی تقاریر کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا، چنانچہ عام اطلاعات اور اخباری اشتہارات کی بجائے، علامہ صاحب طلباء و طالبات، علم دوست و روشن خیال حضرات کو مدعو کر کے مختلف عنوانوں پر لکچر دیا کرتے تھے۔ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ قبل ازیں سورۃ لھب کے مضامین پر تقریر کرتے ہوئے علامہ صاحب نے اپنی علمیت کا لوہا جدید دور کے ماہروں سے منوا لیا تھا۔ علامہ صاحب نے ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے کوشش کی ہے کہ اسلامی تعلیمات کو آسان انداز میں پیش کیا جائے۔

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى * اِنَّ فِیْ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى * صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى *

حضرات! قرآن مجید کی یہ آیات میں نے فقط قرأت کی نقطۂ نگاہ سے نہیں پڑھیں اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ کے سامنے پوری سورۃ کی مکمل تفسیر بیان کروں، کیونکہ اس کے لئے کئی گھنٹے درکار ہیں۔ لہذا اس سورۃ کی صرف چند آخری آیات کی تفسیر آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں۔ ان آیات میں

Marfat.com

پہلا حکم یہ دیا گیا ہے کہ لوگوں کو یاد دلائیں، اگر یاددہانی کارگر ہو۔ یاددہانی کا عمل نہایت مفید اور کارگر ہوتا ہے، کیونکہ اس طرح جسے شعور و آگہی کی نعمت حاصل ہوگی، وہ نصیحت سنے گا اور جو بد نصیب ہوگا وہ نہیں سنے گا۔ مؤخرالذکر اشخاص کی ناپاکی کو مٹانے کے لئے نصیحت کے بجائے دوزخ کی آگ زیادہ موزوں ہے، کیونکہ اس طبیعت کے لوگوں کو پاک صاف کرنا آسان کام نہیں، ایسے لوگ یاددہانی اور وعظ و نصیحت کی باتوں کو سن ہی نہیں سکتے۔ انہیں اس سے بڑھکر کسی شدید ترین چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ لوہے کی سلاخ کو گلانے کیلئے آگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے بغیر اُسے کاٹنا اور اس کے حصے بخرے کرنا ناممکن ہے۔

کسی شخص میں اگر معمولی سوجھ بوجھ موجود ہو تو وہ اپنے آپ کو پاک صاف رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس طریقے سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ہوسکتا ہے۔ لیکن افسوس! ہم میں سے اکثر لوگ موجودہ عارضی زندگی کی مصروفیات اور دنیاوی کاروبار میں اتنے منہمک اور مگن ہیں کہ نہ تو انہیں سچائی سے کوئی دلچسپی ہے، نہ انہیں زندگی کے حقائق کا احساس ہے اور نہ وہ کسی کی یاددہانی پر کان دھرنے کے لئے تیار ہے، اسی وجہ سے فرمایا جارہا ہے کہ: بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا یعنی تم عقبیٰ کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔

آیات زیر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ سے لوگوں کا یہی وطیرہ اور عام انسانی روش رہی ہے، چنانچہ آگے اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ قرآن مجید سے پہلے جو آسمانی کتب اور صحائف نازل ہوئے اس میں بھی انسان کی اسی کمزوری کی نشاندہی کی گئی تھی۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحائف میں بھی اس حقیقت کا بیان موجود ہے۔ پس اے لوگو! تم اپنے آپ

کو پاک کرو، اپنی زندگی کا تزکیہ کرو اور موجودہ زندگی سے زیادہ ترقی یافتہ، پائدار اور لامتناہی زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ دنیا کی زندگی کے عارضی لوازمات اور معمولی خواہشات میں مت الجھو، بلکہ اپنے آپ کو اس سے بچاؤ۔ علاوہ ازیں اس سورۃ میں اور بھی بنیادی حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ دراصل ہر لفظ کی تشریح و تفسیر کے لئے کئی گھنٹے درکار ہیں، چنانچہ اسی وجہ سے میں اس سورۃ کی تفسیر ابتدا میں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اگر اسے ابتدا سے بیان کیا جائے تو یہ بڑی کٹھن ذمہ داری کا کام ہے، تاہم اس کا کچھ پس منظر بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس سورۃ کی ابتدا انسانی تخلیق کے بیان سے ہوتی ہے اور تخلیق کے تمام مراحل ان چند الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں: ... خَلَقَ فَسَوّٰى * وَالَّذِىْ قَدَّرَ فَهَدٰى * وَالَّذِىْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى * ان میں سے ہر آیت میں اس ارتقائی مرحلہ کا بیان ہو رہا ہے، جو ہزاروں سالوں پر محیط ہے۔ پہلے انسانی پیدائش کے ابتدائی مراحل کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے بعد اسے صحیح سالم بنایا۔ اس کے بعد اس نے اس کی شکم مادر میں تقدیر مقرر فرمائی۔ دنیا میں آنے کے بعد اس کے لئے ہدایت کا سامان فراہم کیا۔ اس کے رزق کے حصول کے لئے زمین میں کھیت اگائے۔ چراگاہوں کا انتظام کیا۔ انسانی زندگی کی اس تدریجی ترقی اور ارتقائی عمل کے بیان سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کیونکر پیدا ہوا ہے، اس کا مقصد زیست کیا ہے؟ وہ کس طرح ترقی کر سکتا ہے اور کس طرح ترقی نہیں کر سکتا۔

قرآن مجید میں ایک اور موقعہ پر زندگی کے تمام مراحل کامیابی سے ہمکنار ہونے والے ایک شخص کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ يٰلَيْتَ قَوْمِىْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِىْ رَبِّىْ (یٰسٓ پ ۲۳) (ترجمہ) کاش میری قوم نے جان لیا ہوتا

کہ اللہ تعالیٰ نے میری کس طرح مغفرت فرمائی۔

کاش میں نے کچھ کیا ہوتا۔ کاش! مجھے خبر ہوتی۔ یہ الفاظ بڑے ڈراؤنے ہیں۔ انسان کی زبان پر یہ الفاظ اس وقت آتے ہیں، جب وقت گذر جاتا ہے اور جو کام اس کے سپرد ہوتا ہے، اس کی انجام دہی میں اس سے کوتاہی واقع ہوجاتی ہے یا وہ اپنے نیک مقصد میں ناکام ہوتا ہے، اس وقت پچھتاؤ سے کام لیتے وہ کہتا ہے کہ کاش! مجھے خبر ہوتی تو یہ خراب کام نہ کرتا اور یہ اچھا کام کرتا۔ عموماً نصیحت پر دھیان دینے والا جب پانی سر سے اونچا ہوجائے اور وقت گذر جائے تو توبہ کرنے لگتا اور پچھتاتے ہوئے کہتا ہے کہ افسوس! میں نے اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری پونجی ضایع کردی۔ افسوس! میں نے فلاں فلاں کی نصیحت کیوں نہ سنی اور ان کی نصیحت آموز باتوں کی قدر کیوں نہ کی۔

سورہ یاسین کی مذکورہ بالا آیت میں اللہ کا ایک رسول جسے اس کی قوم نے شہید کیا تھا اور بالاخر وہ لوگ رسولوں کی نصیحت نہ سننے کے نتیجہ میں تباہ و برباد ہوئے، چنانچہ وہ اپنی قوم کی بد نصیبی پر افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کاش! میری قوم کے لوگ جان لیتے اور نصیحت کی بات مان لیتے۔ پچھلی بار ہم نے شعور کے بارے میں گفتگو کی تھی اور اب ذکر کے بارے میں گفتگو کررہے ہیں۔ انسانی شعور اور ذکر فطری طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہے۔ جب انسان اپنا شعور کھو بیٹھتا ہے تو ذکر و فکر اسے یاد دلانے لگتا ہے کہ کس چیز کو تم نے بھلا دیا ہے۔ عام طور پر مسلمانوں نے ذکر کا لفظ سنا ہے، لیکن اس کے جو خوبصورت معنیٰ ہیں، عام طور پر کوئی نہیں سمجھتا۔

ذکر کے متنوع معنائوں پر متعدد جلد لکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن یہاں اس کے بارے میں مختصر طور پر گفتگو کی جائے گی۔ ذکر کے معنیٰ یاددہانی کے ہیں۔ قرآن مجید کی سورۃ فلق میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ

(ترجمہ) یعنی میں اندھیرے کے شر سے پناہ مانگتا ہوں، جب وہ واقع ہوتا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ اندھیرا کیا ہے، جو انسانی سوچ اور انسانی شعور پر غالب ہوتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ تاریکی انسانی خواہشات، اس کے جذبات، مادی لوازمات، دنیاوی تعلقات، حیوانی جبلت اور مادے کی وہ تاریکی ہے، جو اس کے ذہن و دل پر غالب ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کی سوچ مفلوج ہو جاتی ہے، فکر غلط راستے پر مڑ جاتی ہے، وہ غفلت کا شکار ہو جاتا ہے اور تاریکی اسے ڈھانک لیتی ہے۔ پھر اسے اس تاریکی سے نکالنے کے لئے ذکر آتا ہے۔ یہ ذکر درحقیقت مسلسل کسی چیز کی یاددہانی کا نام ہے، جو اس کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے تاکہ انسان اپنے آپ کو بالکل کھو نہ بیٹھے۔ بنا بریں ذکر کے معنیٰ ہیں شعور کو صحیح طور پر قائم رکھنا۔

اس موقعے پر شروع میں ایک بات ذہن نشیں کریں، جس کا آپ نے استحضار نہیں کیا۔ یہاں ہم کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتے۔ نہ کوئی اخلاقی فتویٰ دے رہے ہیں۔ یعنی ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ اچھا ہے اور یہ برا ہے۔ یہ اعلیٰ ہے اور یہ ادنیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فطری قانون اپنی تقدیر کی راہ پر قائم اور برقرار ہے۔ ارشاد فرمایا جارہا ہے: قَدَّرَ فَهَدٰى یعنی قدرت کا قانون مقرر اور متعین شدہ ہے اور وہ اپنا کام سرانجام دے رہا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اس منزل پر پہنچیں، جہاں سے وہ گزر رہا ہے۔ انسان کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ اپنا مشاہدہ اور محاسبہ کرتا رہے اور دیکھے کہ میں کیوں اب تک یہیں پر ہوں، نہ آگے بڑھتا ہوں اور نہ پیچھے دیکھ رہا ہوں؟

ہر جاندار زمین پر گھاس اور چارہ تلاش کرتا ہے۔ وہ زمین پر ہی ہر عمل کرتا ہے، اس کی نگاہ زمین سے آگے نہیں جاتی۔ لیکن چونکہ انسان کی تخلیق صراط مستقیم پر ہوئی ہے، اس لئے وہ اوپر بھی دیکھتا ہے اور نیچے بھی۔ آگے

Marfat.com

بھی دیکھتا ہے اور پیچھے بھی، ادھر ادھر بھی نگاہ دوڑاتا ہے اور ماحول سے بھی متاثر ہوتا ہے۔

اس لئے اس سورۃ میں ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، پھر اسے سیدھا کیا، تاکہ وہ اوپر کی طرف دیکھے۔ ضرورت ہو تو ستاروں کی طرف دیکھے، نہ صرف ستاروں کی طرف بلکہ بقول علامہ اقبال:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

یعنی ستاروں سے بھی آگے نہایت ہی وسیع کائنات ہے، لہذا نگاہ کو صرف ستاروں تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری چیزیں اونچی یا نیچی، اچھی یا خراب ہیں۔ کوئی بھی اچھا اور برا نہیں۔ آیئے صحیح نقطۂ نگاہ اور صحیح معیار پر پرکھنے کی کوشش کریں کہ ہماری ضروریات کیا ہیں اور دیکھیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ اگر ہم حیوانی سطح پر کھڑے ہیں، جس کا کام صرف چارہ تلاش کرنا ہوتا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد غذا کی تلاش اور رات کی نیند کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر انسان کی ساری تگ ودو کا مقصد بھی یہی ہو تو پھر آپ اپنے آپ کو یہ طفل تسلی نہیں دے سکتے کہ آپ اس جانور سے افضل اور بہتر ہیں، بلکہ ایسا انسان سب سے بد تر ہے۔

اس لئے آپ اپنا رویہ درست کریں اور یہ سوچیں کہ آپ کہاں کھڑے ہیں، کیا چیز آپ کو متاثر کررہی ہے؟ کس کے ساتھ مجھے محبت ہے؟ اور کس چیز کی میرے اندر خواہش ہے؟ اپنی رہنمائی کے لئے میں اتنا ہی کرسکتا ہوں، اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اس میں نہ کوئی اچھائی ہے اور نہ برائی۔ مجھے صرف یہ جستجو کرنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس کائنات میں، میں کہاں کھڑا ہوں۔ جیسا کہ پہلے بھی میں نے کہا تھا کہ خود کو دھوکے میں مبتلا نہ کریں، یہ بہت

76663

Marfat.com

بڑا جرم ہے۔ اس سے بڑا کوئی جرم نہیں ہوسکتا۔

اخلاقی اعتبار سے ہم اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ چیز اچھی ہے اور یہ بری۔ لیکن کسی چیز کو صرف سطحی طور دیکھنا صحیح نہیں، ہر چیز کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انگریز قوم پرستی اور جرمن نسل پرستی کے نظریے سے اوپر سوچنے کے لئے تیار نہیں تو ہمیں اس کے خلاف اخلاقی فتویٰ دینے کی ضرورت نہیں۔

ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ قومیں انسانی ارتقا کے سفر میں اس منزل پر ہیں کہ صرف اپنا قومی مفاد عزیز رکھتی ہیں۔ اگرچہ ہم بھی بین الاقوامیت کی بات کرتے ہیں، لیکن عملاً ابھی اس منزل پر پہنچ نہیں پائے۔

بہرحال یہ ان لوگوں کی قومی ذمہ داری ہے کہ حقائق کا ادراک کرتے ہوئے سوچیں کہ وہ ابھی تک نسل پرستی کے تصور سے آگے نہیں بڑھے، مگر ہمیں بھی شیخی بگھاڑنی نہیں چاہئے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ کہے کہ میں کائنات میں اعلیٰ مقام کا حامل ہوں اور یہ کہ میرے سامنے انسانیت کی کوئی حیثیت نہیں، کائنات صرف میرے لئے ہے اور جو کچھ اس میں ہے اس پر میری اجارہ داری ہے اور یہ کہ ہم مسلمان توحید پر یقین رکھتے ہیں، جبکہ انگریز توحید پر یقین نہیں رکھتا۔ جرمن قوم صرف نسل کی پوجاری ہے، وہ توحید کے نظریے کو نہیں مانتی، اس لئے ہم ان سے اچھے ہیں کیونکہ ہم موحد ہیں۔ یہ رویہ ہمارے لئے سودمند نہ ہوگا، کیونکہ ہم نے ابھی توحید کے حقیقی تقاضوں اور وحدت انسانیت کے نظریے کو نہیں اپنایا۔

مجھے دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ آنکھیں دے تاکہ میں یہ دیکھ سکوں کہ درحقیقت میں کہاں کھڑا ہوں۔ کہیں میں سفر حیات کے آخری درجہ پر تو نہیں کھڑا؟ اے اللہ! مجھے موحد بنا اور بلند درجہ پر فائز فرما۔ اس طرح کی دعا کرنا زیادہ

مستحسن بات ہے بنسبت اس کے کہ میں یہ دعویٰ کرتا پھروں کہ میں موحد ہوں۔ عظمت اسی میں ہے کہ میں یہ اعتراف کروں کہ میں ابھی اس مقام اور اس منزل پر نہیں پہنچا، جہاں پہنچ کر انسان اشیاء کی وحدت پر یقین رکھتا ہے۔ خود فریبی اور جھوٹی دعویٰ سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ فروتنی اختیار کی جائے۔

پس ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو دیکھے اور اپنا احتساب کرتے ہوئے فیصلہ کرے کہ وہ کس مقام اور کس منزل پر کھڑا ہے۔ بازار میں گھوم پھر کر دیکھے کہ اسے کیا چیز زیادہ متاثر کرتی ہے۔ ہوٹل اور کپڑے کی دکان یا کتابوں کی دکان؟ اس کی اشتہا کا مرکز کیا چیز ہے؟ اس طرز عمل سے اس پر واضح ہوجائے گا کہ اس کا رخ کس طرف ہے؟ اگر مٹھائی کی دکان اس کی دلچسپی کا مرکز ہے تو اسے اندازہ ہونا چاہئے کہ وہ زندگی کے کس اسٹیج پر کھڑا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا پیٹ ہی اس کی شخصیت کا محور ہے۔ اگر کسی بک شاپ پر کھڑا ہے تو اسے سمجھنا چاہئے کہ اس کا ضمیر بیدار ہوچکا ہے، جسے علمی غذا کی تلاش اور جستجو ہے۔ یوں وہ اپنے لئے منزل متعین کرسکتا ہے کہ زندگی کا سفر کہاں سے شروع کیا جائے اور کس طرح آگے بڑھا جائے۔ لیکن اگر کسی شخص کو سرے سے یہ پتہ ہی نہ ہو کہ وہ کہاں کھڑا ہے تو پھر وہ کس طرح اپنی منزل متعین کرے گا اور کس طرح حقیقی منزل کی طرف آگے بڑھے گا۔ اس لئے اولین اہمیت اس بات کی ہے کہ "من عرف نفسهٗ فقد عرف ربهٗ" (ترجمہ) جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ یعنی پہلا کام خود شناسی کا ہے، اس لئے پہلے اپنے نفس کو پہچاننے کی ضرورت ہے، اپنے آپ کو دیکھیں کہ آپ کہاں کھڑے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

مجھے اگر کوئی شخص اپنی حقیقت سے آگاہ کرے تو میں مشتعل ہوجاتا ہوں، کوئی ناصح اور واعظ جب کسی چیز کی یاددہانی کراتا ہے، جو میرے لئے مفید

Marfat.com

بھی ہوتی ہے تو بھی مجھے غصہ آتا ہے، اس طرز عمل میں میرے لئے کافی اشارہ ہے کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔

میں نے گذشتہ دنوں سورہ کہف کی آیات قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۔ اَلَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۔ الخ کا حوالہ دیا تھا۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اے لوگو! کیا تمہیں بتاؤں کہ اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ نقصان میں کون ہے؟ وہی جس نے زندگی کے سفر میں اپنی کوششیں ضائع کر دیں، اس کے باوجود وہ سمجھتا ہے کہ وہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے رہا ہے۔

یعنی جو شخص اپنے خول میں بند ہو، اپنا راستہ بھلا بیٹھا ہو، پھر بھی یہ دعوی کرتا ہو کہ وہ اچھے کام کر رہا ہے اور اپنا موقف منوانے کے لئے بحث بازی بھی کرتا ہو، ایسے شخص کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے کہ قیامت کے دن اس کے اعمال کو کوئی وزن حاصل نہ ہوگا۔

اسی حقیقت کو ایک فارسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے:

آنکس کہ نداند و داند کہ بداند

در جہل مرکب ابد الدہر بماند

(ترجمہ) جو شخص کچھ نہیں جانتا اس کے باوجود اسے یہ زعم اور دعویٰ ہے کہ وہ بہت کچھ جانتا ہے تو وہ ہمیشہ جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے، وہ جاہل مطلق ہوتا ہے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ لوگوں پر، قوموں پر، افراد پر یا تاریخ کے کسی دور کے بارے میں ہم کوئی اخلاقی فتویٰ دیں، ہمیں چاہئے کہ حقائق کا ادراک اور مطالعہ کر کے دیکھیں کہ ہم کہاں تھے، کہاں کھڑے ہیں اور دنیا کس طرف ہمیں لیے جا رہی ہے؟ ابھی کتنا سفر باقی ہے؟ یہ بات ہمیں قوموں کے عروج و زوال

Marfat.com

اور انسانی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ قوموں نے کب اور کہاں اور کونسی غلطی کی، کیونکر ٹھوکر کھائی۔ ترقی کے اسباب کیا تھے اور تنزل کے محرکات کیا تھے۔ تاریخ کا یہ مطالعہ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے میں مدد کرے گا اور اس منزل پر پہنچائے گا، جس کا اس آیت میں بیان ہے کہ: قدر فھدی یعنی مقرر کردہ منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرے گا۔

اسی مناسبت سے مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک عورت نے کارلائل (Carlyle) کو لکھا کہ مسٹر کارلائل میں سمجھتی ہوں کہ اب میں نے کائنات کے ساتھ صلح کرلی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اگر ایسا ہے تو تم نے صحیح کیا۔ ہمارے یہاں جن لوگوں نے ابھی کائنات کے ساتھ مصالحت نہیں کی، وہ پوچھتے ہیں کہ خدا کی ہستی کیا ہے اور کہاں ہے؟ ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس نے کائنات پیدا کی ہے وغیرہ وغیرہ۔

دوستو! سب سے پہلے آپ سوچیں کہ آپ کی پیدائش کے وقت آپ سے مشورہ تو نہیں لیا گیا تھا۔ آپ اپنی خوشی سے اس دنیا میں نہیں آئے۔ اللہ کی مشیت کے مطابق ہی آپ کو اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ تو کیا یہ بے وقوفی کی بات نہیں ہے کہ شترمرغ کی طرح ریت میں منہ ڈال کر یہ کہا جائے کہ میرا اس کائنات سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ کو خواستہ یا ناخواستہ ان حالات کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ پیٹ بھرنے کے علاوہ بھی آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ دنیا میں آئے ہیں تو حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوگا، آپ پسند کریں یا نہ کریں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کارلائل کہتا ہے، جتنا جلدی آپ وہ راستہ تلاش کریں، جس پر فطرت آپ کو چلانا چاہتی ہے، اتنا ہی آپ کے لئے بہتر ہے۔ آپ کا یہ طرز عمل آپ کو بہت سی پریشانی اور تفکرات سے بچائے گا۔ ہکسلے (Huxley) کہتا ہے کہ فطرت ہمیشہ پہلے تنبیہ بن کر آتی ہے اور پھر تھپڑ مارتی ہے اور کبھی

Marfat.com

کبھار تھپڑ تنبیہ بن کر آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی انتباہ سے پہلے ٹھوکر بھی لگتی ہے، لہذا خود کو غیر ضروری تھپیڑوں سے بچائیں، ہوسکتا ہے کہ یاددہانی سے آپ صحیح راستہ پر گامزن ہوجائیں۔ آپ بڑی آگ کا انتظار نہ کریں، جو آپ کو لوہے کی سلاخ کی مانند گلاکر صاف کرے۔ کسی چیز کو دھوکر بھی پاک صاف کیا جاسکتا ہے اور کبھی کبھار یہ عمل مؤثر اور کارگر ثابت ہوتا ہے۔ اگر کسی انسان کی فطرت لوہے کی سلاخ کی مانند سخت ہے تو قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کے نتیجے میں اسے آگ میں جلا کر صیقل کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں پانی کے ذریعے صفائی کی بجائے آگ درکار ہوتی ہے، دوزخ کی آگ کے بارے میں تعجب میں نہ پڑیں۔ قدرت انسانی غلاظت کو صاف کرے گی، خواہ اس مقصد کے لئے اسے آگ کا استعمال کیوں نہ کرنا پڑے۔ اگر تذکیر اور یاددہانی ممد و معاون ثابت نہ ہو تو ہمیں آگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اس کے لئے ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بھی ہونا چاہیئے، کیونکہ فطرت آپ کو آگ میں ڈال کر درحقیقت آپ کی بھلائی کا کام کررہی ہے۔ آپ آتشِ نار میں صاف اور صیقل ہوکر نکلیں گے تو اس میں بھی آپ ہی کی بہتری ہے۔

الغرض متعدد مذاہب میں پاکی کا تصور موجود ہے اور عبادت کے لئے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کے ایک معنیٰ حرارت حاصل کرنا اور جلنا بھی ہیں۔ ہندو مذہب میں عبادت کیلئے "تپش" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کسی کو آلودگی اور نجاست سے پاک صاف کرنے لئے گرمی پہنچانا۔ ہم مسلمان عبادت کیلئے صلوٰۃ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اس کا مادہ ہے صلیٰ، جس کے معنیٰ ہیں پکانا، جلانا اور بھننا۔ ہر جگہ پاکی اور صفائی حاصل کرنے کیلئے گرمی اور تپش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ نفس کی پاکی کیلئے حرارت کا یہ طریقہ استعمال نہیں کرتے تو پھر بڑی آگ کی ضرورت درپیش ہوگی۔ سب لوگ جانتے ہیں بعد از

مرگ دوزخ ہے، جہاں چیزیں جل کر پاک صاف ہوجائیں گی۔ کوئی اگر جلنے کے بعد بھی پاک صاف نہ ہو تو اسے انتظار کرنا پڑے گا۔ دوزخ اسے خود بخود پاک کرلے گی، کیونکہ ہر شخص پاک صاف رہنا چاہتا ہے۔ کوئی شخص آلودہ اور گندہ رہنا نہیں چاہتا۔

جب آپ کو بخار آتا ہے تو اس طریقہ سے دراصل آپ کے اندر کی گندگی صاف کی جاتی ہے، اس بنا پر بخار اکثر آپ کیلئے مفید ثابت ہوتا ہے، خواہ آپ اسے بیماری اور مصیبت ہی کیوں نہ سمجھیں، مگر ایسا نہیں، یہ مصیبت نہیں ہوتی۔ فطرت آپ کو پاک صاف رکھنا چاہتی ہے اور یہ وہ عمل ہے جو آپ خود کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ آپ کے جسم کے جراثیم کو بخار کی گرمی کے ذریعے ختم کرنا چاہتا ہے۔ اگر یہ بخار 108 سینٹی گریڈ سے اوپر چڑھ جائے تو آپ کو مار دے گا، اگر آپ احتیاط کریں گے تو بخار 108 گریڈ تک نہیں پہنچے گا۔ جب احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی گئیں تو یہ مرحلہ پیش آیا۔ اگر بخار کی اس اسٹیج پر پہنچنے کے باوجود آپ کے جسم کے جراثیم نہیں مرتے اور اندرونی گندگی ختم نہیں ہوتی تو پھر آپ کو لازماً مرنا پڑے گا۔ بالکل اسی طرح جسمانی آگ بھی انسان کو پاک صاف کرتی ہے، نیز جسمانی آگ کی طرح اخلاقی آگ بھی انسان کو گناہوں کی گندگی اور میل کچیل سے پاک کرتی ہے۔ یعنی انسان کا گناہوں سے توبہ تائب ہونا، رونا، پچھتانا اور نفس کو نیکی کی راہ پر چلانے کے لئے تیار کرنا، یہ اخلاقی آگ ہے۔

ساٹھ ستر سال گزارنے کے بعد جب عام طور پر انسان مرجاتا ہے تو پچھتانے لگتا ہے، قرآن کے الفاظ میں: يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ اس وقت ہم توبہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کاش! ہمیں پتہ ہوتا کہ یہ مرحلہ بھی آنے والا ہے تو اس کے لئے تیاری کرتا۔ یہ صورتحال اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ہم تذکیر یعنی

Marfat.com

یاد دہانی اور وعظ و نصیحت کی طرف توجہ نہیں دیتے، بلکہ ہم اس کے مقابلے میں سرکشی کرنے لگتے ہیں اور جب کوئی شخص ہمیں نصیحت کرتا ہے تو ہم اس پر اعتراضات کرنا شروع کرتے ہیں، ناصح کی نصیحت کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے اس کی تکذیب کرتے ہیں اور اسے گالیاں دیتے ہیں۔ جب یوم حساب آئے گا تو پند و نصیحت سے اعراض کی بنا پر ہکسلے کے الفاظ میں آدمی کو چماٹ لگتی ہے، کیونکہ یہی قانونی قدرت ہے کہ جو شخص صحیح رخ اختیار نہیں کرتا، فطرت کے قوانین اسے سیدھا اور پاک صاف کرنے کے لئے حرکت میں آتے ہیں۔ اس میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ اس لئے جتنا جلدی ہمیں اس بات کا شعور حاصل ہو کہ ہم کہاں ہیں، اتنا جلد ہم صراط مستقیم پر چلنے کے قابل ہو جائیں گے، صراط مستقیم پر چلنا ہی انسان کی کامیابی ہے اور یہی ارتقاء کی معنیٰ ہیں۔

ہم نے بہت سے مراحل طے کیے ہیں۔ آج ہر آدمی یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ مختلف ادوار اور مراحل سے گزرا ہے۔ اس وقت ہمیں جو کچھ درپیش ہے، اس کے بعد بھی ہمیں بہت سے ادوار سے گزر کر اس جگہ پر پہنچنا ہے، جو ہماری حقیقی منزل ہے۔ اس وقت ہم جس جگہ کھڑے ہیں، وہ ایک راستہ ہے، اس منزل کی طرف چلنے کا جو قدرت نے انسان کے لئے مقرر کی ہے، بلکہ اس سے بھی بہت آگے چلنا ہے اس لئے ہم میں سے ہر ایک کو چاہیئے کہ وہ اپنی حیثیت معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ اب میں سورۃ اعلیٰ کی آخری آیت پڑھتا ہوں:

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی * صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی *

حضرت ابراھیم علیہ السلام آج سے 4000 سال پہلے رسول بن کر آئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تین ہزار سال پہلے۔ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ یہ ایک مقصد کے تحت آئے تھے، تاکہ لوگوں کو خبردار کریں اور ان کی رہنمائی کریں کہ تم نے

Marfat.com

زندگی کا سفر کہاں سے شروع کیا اور تمہاری منزل کیا ہے۔ میں تورات اور انجیل ساتھ لایا ہوں، تاکہ آپ کو بتایا جاسکے کہ انسان نے توریت سے انجیل کے مختصر زمانے میں کتنی پیش رفت کی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو اللہ تعالیٰ کے مشہور دس احکام دیے کہ قتل نہ کرو، زنا نہ کرو، اپنے بھائی کے خلاف جھوٹی گواہی مت دو، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو کچھ مزید احکامات عنایت فرمائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تقریباً ایک ہزار سال کا فرق ہے، لیکن دونوں کی تعلیمات کی نوعیت میں واضح فرق ہے، جس سے پتہ لگتا ہے کہ حالات اور زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اسلامی احکامات کی نوعیت میں بھی فرق آجاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو حکم دیا کہ قتل مت کرو، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آکر مزید فرمایا کہ میں اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ جو شخص اپنے بھائی سے بغیر سبب کے ناراں ہوگا، وہ قیامت کے دن اذیت میں مبتلا ہوگا، بلکہ جو اشتعال کی بنا پر اپنے بھائی کو بے وقوف کہے گا وہ بھی آگ میں ڈالا جائے گا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہدایت کی تھی کہ زنا مت کرو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ تم میں سے جو شخص کسی غیر عورت کی طرف شہوت کی نگاہ سے دیکھے گا وہ گویا دل میں زنا کر چکا۔ حالانکہ عملاً اس کا ارتکاب نہیں ہوتا، مگر چونکہ دل میں خیال کر چکا اور اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے، اس بنا پر گویا وہ اس جرم کا ارتکاب کر چکا۔

آپ نے دیکھا کہ ایک ہزار سال کے عرصے میں احکامات الٰہی کی نوعیت میں کیا سے کیا فرق واقع ہوا۔ جب انسان ظاہری عمل سے آگے بڑھ کر محسوسات اور وجدان کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ جسم کی تحلیل یا اس کا خاتمہ کوئی بات نہیں، روح کا خاتمہ ہی سب کچھ ہے۔ اس لئے اگر آپ کے

Marfat.com

ہاتھ برائی کرتے ہیں تو ان کو کاٹ دو، اگر آنکھیں جرم کرتی ہیں تو ان کو نکال دو، مگر اپنی روح کو خراب نہ کریں۔ اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰهُ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ (ترجمہ) مگر جو شخص اپنے رب کے پاس صحیح سالم دل لے آئے۔ یعنی کوئی شخص اللہ کے نور سے نہیں دیکھ سکتا جب تک وہ پاک دل سے اللہ تعالیٰ کے پاس آئے۔ یعنی اصل اہمیت پاک دل کی ہے نہ ہاتھوں کی۔ آپ کوئی کام اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں مگر نیت دل سے کرتے ہیں، سوچتے اپنے اندر سے ہیں۔ لیکن اگر آپ کا وجدان خراب ہے تو سارے عمل بیکار ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب انسان کے اندر روشنی پیدا ہوگی تو وہ کسی نتیجہ پر پہنچے گا۔ انسان کا ظاہری و جسمانی عمل خراب ہوسکتا ہے۔ لیکن بنیادی اہمیت انسانی سوچ اور خیال کو حاصل ہے۔ اگر وہ اپنے خیالات و تصورات میں پاکیزگی پیدا نہیں کرتا تو وہ ناپاک ہے۔ انسان بہت سی اشیاء کا مجموعہ ہے اور زندگی کے اس سفر میں وہ مختلف اور مشکل سطحوں پر آگے بڑھ رہا ہے، روحانی سطح پر بھی اور جسمانی سطح پر بھی وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس طرح ایک نیا انسان وجود میں آتا ہے جسے ہم ''ذہنی انسان'' کہتے ہیں۔ یہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور پیغام کا نچوڑ اور تبلیغی فرق۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے بارے میں ہم یہاں اکثر بیان کرتے رہتے ہیں، اگر زندگی رہی تو اس سلسلے کو مزید بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ اسلام میں نیت کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انما الاعمال بالنیات (ترجمہ) اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ یعنی نیت کی پاکیزگی لازمی ہے، سوچ اور عمل کا مرحلہ بعد میں آتا ہے۔ نیز فرمایا کہ نیة المؤمن خیر من عملہ مؤمن کی نیت اس کے عمل سے اچھی ہوتی ہے۔ یعنی اصل اہمیت نیت اور دل کے خلوص کی

ہے۔

اس لئے ہمارے نزدیک جسمانی اور ذہنی انسان کے ساتھ ساتھ تیسرا انسان بھی ہے۔ اب آئیے کچھ دیر کے لئے ان انسانوں کے بارے میں غور وفکر کریں۔ اگر ہم میں سے کوئی پیٹ کا پوجاری ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ اپنے بارے میں فکر کرے، اپنے وجود کو ٹٹولے، کیونکہ وہ ابھی حیوانی سطح سے اوپر نہیں اٹھا۔ انسان جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو چھ ماہ کے بعد وہ اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔ یعنی ماں کے پیٹ میں بھی اس کی غذا کا انتظام موجود ہے اور دنیا میں آنے کے بعد بھی وہ کھاتا پیتا رہتا ہے۔ بچپن میں بھی اسے کھانے پینے کی فکر ہوتی ہے اور بڑا ہونے کے بعد بھی اسے صرف یہی فکر دامنگر ہوتی ہے تو پھر وہ آخر کس طرح یہ دعوی کرسکتا ہے کہ وہ "ذہنی انسان" بن گیا ہے؟ اس سے تو معلوم ہوا کہ ابھی آپ کے اندر شعور و آگہی اور بیداری کی لہر نہیں ابھری۔ اس صورتحال میں تو آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ آپ یہ تسلیم کریں کہ میرے اندر ابھی روشنی پیدا نہیں ہوئی۔ آپ اپنی فکر کو پاک صاف کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس جانب کوئی توجہ ہی نہیں دیتے۔ دل کی دنیا میں مادیت اور خراب خیالات بسے رہتے ہیں! مگر آپ کو کوئی فکر دامنگیر نہیں وجہ یہ ہے کہ ابھی آپ کا ذہن بیدار نہیں ہوا اور اس میں تحرک برپا نہیں ہوا، بلکہ وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ آپ کا ذہن صرف پیسوں کی سوچ رکھتا ہے، اسے فقط پیٹ بھرنے کی فکر رہتی ہے، اس سے آگے بڑھکر اس میں عمدہ خیالات موجزن نہیں ہوتے۔ یہ حیوانی سطح نہیں تو اور کیا ہے۔

آپ ابھی تک اس بلند اور اعلیٰ سوچ پر نہیں پہنچے، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ کو لے جانا چاہتے تھے، بلکہ ابھی تو آپ سوچ رکھنے والے انسان ہی نہیں بنے۔ سوچنے سمجھنے والا انسان آپ کے اندر موجود ہی نہیں ہے۔ صرف

جسمانی اور مادی سوچ آپ کے ساتھ ہے، جو آپ کو مادی خواہشات کی تکمیل کے لئے کھینچے چلی جارہی ہیں۔ آپ کے اندر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ آج میں مٹھائی کھاؤں، گوشت کھاؤں، لیکن اس سے اعلیٰ و پاکیزہ خیال کا آپ کے اندر گذر تک نہیں ہوتا کہ آپ یہ سوچنا شروع کریں کہ میں کوئی چیز دریافت کروں، علم حاصل کروں۔ انسان کی خدمت کا فریضہ سرانجام دوں۔ اس لئے آپ کا فرض ہے کہ اس بات کا جائزہ لیں کہ آپ کائنات کے اس سفر میں کہاں کھڑے ہیں، اتنی پست سطح پر کس طرح پہنچے اور کس طرف چلے جارہے ہیں؟ آپ کے سارے خیالات واحساسات پاکیزہ ہونے چاہئیں۔ آپ اس بات کے قابل ہوجائیں کہ اپنے آپ سے کہہ سکیں کہ میں نے آج اچھی بات سوچی۔ آج میرا ذہن صاف ہے۔ آج کسی کے بارے میں، میں نے غلط بات نہیں سوچی، کسی کو میں نے گالی نہیں دی، کسی کو اذیت دینے اور مارنے کا پروگرام نہیں بنایا۔ یہ خیالات آپ کے وجدان میں اس وقت آسکتے ہیں، جب آپ کا ذہن صاف شفاف ہو، بیدار اور روشن ہو۔ یوں انسان بتدریج ترقی کرتا ہے۔ نباتاتی مراحل سے حیوانی مراحل تک۔ حیوان کے بعد انسان بننا، انسان کے بعد ذہنی انسان بننا، اس کے بعد روحانی انسان بننے کا عمل ہے، اس سارے عمل کے دوران آپ کی مرضی اور آپ کی نیت نتیجہ خیز ہوگی، اس کو مقدر کہتے ہیں جو اس دنیا میں بنتا ہے۔ ہمیں یہ چیز دوسروں سے سیکھنی چاہئے۔ اگر آپ اپنے اندر یہ مقدر پیدا نہیں کرسکتے، جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ع نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ تو پھر آپ اس کائناتی مقدر کو روک نہیں سکتے، جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے مقرر کردیا ہے۔ پس جیسا کہ میں نے بار بار عرض کیا، ہم اپنا جائزہ لیں، اپنی انسانی سطح کا مطالعہ کریں کہ ہم آگے بڑھے یا نہیں؟ شاید ہم میں سے اکثر اس حیوانی سطح سے بلند نہیں ہوئے، جہاں پہنچنے کے بعد انسان صرف کتوں اور

Marfat.com

بندروں کی طرح ہڈیوں پر لڑتے جھگڑتے ہیں، مگر میں کہہ سکتا ہوں کہ ہم میں بعض لوگ ایسے ضرور ہیں جو اس حیوانی سطح سے بلند ہو چکے ہیں اور ہڈیوں پر لڑنے کے عمل کو پسند نہیں کرتے اور اس عمل میں حصہ دار نہیں ہوتے۔

جرمن فلسفی شاپنھایر (Shaupenhaur) سے پوچھا گیا کہ آپ صرف سوچتے ہی رہتے ہیں، پیسے کمانے کی فکر نہیں کرتے؟ اس نے کہا کہ مجھے زندگی اس سے کہیں زیادہ پاکیزہ اور عمدہ نظر آتی ہے، اس لئے میں اس مقصد کے بارے میں سوچنا پسند کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ پوری عمر زندگی کے بارے میں سوچنے میں مصروف رہا، اس نے دولت کمانے اور کھانے پینے کی چیزوں لینے کی کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ اسی طرح کا واقعہ ایک بدھ بھکشو کا ہے، جو فقیرانہ لباس میں کشتہ لیے جارہا تھا، جس میں کچھ پیسے تھے۔ اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ اس کشتہ میں جو کچھ ہے وہ پھینک دے، تجھے پورا دن پیٹ کی فکر کے مقابلے میں زیادہ اہم کام سرانجام دینا ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ چیزیں کس طرح ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ اس اصول کو جتنا جلد سمجھا جائے، اتنا ہمارا فائدہ ہے۔

اب ہم اس سورۃ کی ایک اور آیت کی طرف آتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (ترجمہ) ان کو یاددہانی کراتے رہیں، اگر یاددہانی سودمند ہو۔ یعنی جو لوگ بد نصیب ہیں صرف وہی یاددہانی اور نصیحت کی بات سننا پسند نہیں کرتے اور جو اللہ سے ڈرتے ہیں وہ ذکر و فکر اور وعظ و نصیحت کی حکمت کو جانتے ہیں، اس لئے وہ اس چیز کو اچھا سمجھتے ہیں۔ یہاں پر یہ نکتہ ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ ذکر شعور و آگہی کا ایک مکمل حصہ ہے، یہ ذکر ہی ہے جو شعور کو اس کا صحیح مقام یاد دلاتا ہے تاکہ وہ اپنے حقیقی مقصد سے بھٹک نہ جائے۔ انسان نے اپنا تزکیہ کر کے جو شعور اور نور حاصل کیا ہے، کہیں

Marfat.com

غفلت اور جہالت کی تاریکی کی وجہ سے وہ ضائع نہ ہوجائے۔ کیونکہ غفلت شعور و آگہی کی روشنی کو اسی طرح چھپالیتی ہے جس طرح رات کی تاریکی روشن دن کو ڈھانپتی ہے اور قرآن مجید کی اس آیت وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تاریکی آتی اور غالب ہوجاتی ہے تو نور اور روشنی غائب ہوجاتی ہے۔ یوں شعور ختم ہوجاتا ہے اور انسان بے شعور بن جاتا ہے۔ اس لئے انسانی زندگی کا اہم مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ شعور و آگہی نہ صرف برقرار رہے، بلکہ آگے بڑھے اور ترقی کرتی رہے۔ اور اگر طبعی عوامل و اسباب اور انسانی کمزوری کی بنا پر کبھی شعور میں کمی واقع ہوتی ہے تو ذکر آگے بڑھکر اسے سہارا دیتا ہے اور انسان کے وجدان میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ اپنے حواس کو برقرار رکھو، صراط مستقیم پر چلتے رہو اور ادھر ادھر مت جھانکو۔

"ذکر" کا مطلب صرف یہ نہیں کہ صرف الفاظ کو دہرایا جائے۔ یہ تو ایک فنی طریقہ ہے، جس کے ذریعے آدمی کوشش کرتا ہے کہ کس طرح یاددہانی کے عمل کو برقرار رکھا جائے۔ ظاہر ہے انسان کو ہوشیار کرنے کے بہت سے طریقے ہیں، انسان جس طریقے سے بھی بیدار اور ہوشیار ہو وہ ذکر ہے۔ بہرحال آپ "ذکر" کی جو بھی معنیٰ بیان کریں، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، مگر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ذکر کا مطلب ہے صراط مستقیم پر چلنا اور چلانے کے لئے ہوشیار کرتے رہنا . تاکہ انسان اپنی خواہشات اور دنیا کے مادی مظاہر کے بھنور میں گرفتار ہوکر حقیقی منزل سے بھٹک نہ جائے اور گمراہ نہ ہوجائے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ قرآن مجید کی آخری سورۃ کے آخر میں خناس کا جو لفظ آیا ہے، اس کے معنی کیا ہیں؟ میں نے کہا اس کے معنیٰ ہیں انسان کا غیر شعوری ذہن، جو حقیقت سے ناآشنا ہو اور ہر قسم کے اوہام اور اشکالات اس کے ذہن میں مجتمع ہوں، نیز ذہن سے وہ کام لینا، جس کی کوئی ضرورت

Marfat.com

نہیں۔ ایسی لاشعوری یا شعوری ذہنیت جو طویل عرصہ سے انسان میں کام کر رہی ہے، جس کی بنا پر وہ غلط کاموں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ غیر شعوری کیفیت ایک ایسی قوت ہے جو ہمیں ماضی کی طرف کھینچتی ہے اور نہیں چاہتی کہ انسان سیدھے راستے پر چلے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب تم نے اپنا کندھا کولہو میں ڈال ہی دیا ہے تو پھر ادھر ادھر مت دیکھو۔ ہمارے شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ جب ایک بار تم صحیح راستہ پر چل پڑے ہو تو پھر ادھر ادھر، دائیں بائیں جانب نہ جھانکو، اپنی نگاہوں کو صحیح منزل اور منظر سے نہ ہٹائیں۔ شعور اور آگہی کی جو نعمت حاصل ہے، اسے ضایع نہ کریں، برسوں کی محنت سے جو ذہن تیار کیا ہے، معمولی غلطی سے اسے نہ بگاڑیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی حالت ایسی ہو جائے کہ اگر آپ ارادہ کریں کہ میں کل یہ غلط کام نہیں کروں گا مگر اسی وقت، اگلے ہی لمحے اس کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ بہر حال ایسی حالت میں بھی اگر آپ کے ذہن میں شعور و آگہی کی روشنی موجود ہو تو ذکر اس کی آبیاری کرے گا اور صحیح راستے پر چلانے میں معاون ثابت ہوگا۔ لیکن آپ کو یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ ضرور کوئی ایسی چیز موجود ہے جو آپ کو غلط کام کرنے پر ابھارتی ہے، جس سے آپ نفرت بھی کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ میں عرض کرتا ہوں کہ یہی خناس ہے، جو آپ کو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ اس خناس پر آپ کو کنٹرول کرنا ہے، جسم اور ذہن کی ایک ایک حرکت پر ضابطہ رکھنا ہے۔ اس بات کی کوشش کرنی ہے کہ کوئی ایسا خیال اور وسوسہ وجدان میں آنے نہ پائے جو آپ کے کنٹرول اور ضابطہ سے باہر ہو۔ خود کو پاک رکھنا چاہتے ہیں تو ناپاک خیالات سے چھٹکارا حاصل کریں، یہی کامیابی کا راز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ـ الیٰ

Marfat.com

صُحُفِ اِبْرَاهِیْمَ وَ مُوْسٰی - یعنی بیشک وہ شخص کامیاب ہوا، جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور اسے پاک کیا۔ ذکر اللہ کا اہتمام کیا اور عبادت کر کے اپنے دل کو برے خیالات اور خناس سے پاک صاف کیا۔ عارضی زندگی پر عقبیٰ کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ آنے والی زندگی دائمی اور پائدار ہے۔

پس خدائی پیغام پر آپ کو بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کوشش کر کے خود کو شیطانی وساوس اور نفسانی خواہشات سے پاک کریں۔ پاک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی سوچ و فکر پر ضابطہ رکھیں، اپنا محاسبہ کرتے رہیں کہ یہ غلط کام مجھ سے کیوں سرزد ہوا یا ہو رہا ہے اور یہ غلط خیال میرے ذہن میں کیوں آیا؟ جب آپ شعور کی اس منزل پر پہنچیں گے تو آپ مسلمان ہیں۔ خود کو مسلمان کہلانے کیلئے نہیں بلکہ میری منشا یہ ہے کہ قرآن مجید کا پیغام آپ تک پہنچ چکا، اس کے سوا میرا اور کوئی مقصد نہیں۔ کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا، جب تک اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور تابعداری نہ کرے۔ جو شخص ادھر ادھر کی لایعنی باتیں اور نظریات سوچتا ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں، اس کا مطلب کیا ہے؟ رسول اکرم ﷺ نے لوگوں کو اپنے گرد کس طرح جمع کیا۔ مدینے کی طرف ھجرت کرنے کیلئے اہل مدینہ سے آپ ﷺ نے کس طرح معاہدہ کیا۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ اس سلسلے میں جو صلح فرمائی اس میں یہ شرط موجود تھی کہ تمہیں یہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا۔ اگر آپ ہماری جماعت میں شامل ہوتے ہیں تو یہ کام چھوڑ دیں اور یہ اختیار کرلیں۔ دوسری صورت میں ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک ﷺ کے فرمودات میں اس چیز کو آپ بار بار سنتے رہتے ہیں۔ یہ کرنا اور نہ کرنا ہی کامیابی کی ضمانت اور معیار فضیلت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے کہ میری امت گمراہی

Marfat.com

پر مجتمع نہ ہوگی۔ اس لئے آپ کا فرض ہے کہ اکثریت کی رائے پر عمل کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ صراط مستقیم پر ہیں یا نہیں، اگر آپ راستہ بھول گئے ہیں تو ان کی پیروی کریں جو صراط مستقیم پر ہیں اور جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے ہیں، مگر جن لوگوں کے قول و فعل میں تضاد ہے، ان کی پیروی نہ کریں۔

نباتات سے پہلے حیوان نہیں تھے، یعنی سب سے پہلے نباتاتی دور آتا ہے، اس کے بعد حیوانی زمانہ۔ حیوانوں سے پہلے انسان نہ تھے۔ زندگی کے اس تسلسل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری ترقی تدریج کے ساتھ ہوئی ہے۔ ایک مرحلہ کے بعد دوسرا مرحلہ ہوتا ہے، ایک منزل کے بعد دوسری منزل۔ آپ کو بھی تدریج کے ساتھ ترقی کرنی ہے۔ پہلے ہاتھوں کو خراب کاموں سے بچائیں، اس کے بعد ذہن کو برائی سے بچائیں، اس کے بعد دل کو برے خیالات اور خواہشات سے بچائیں۔ کیونکہ جب کوئی ہاتھوں کو برائی سے نہ بچاسکے تو بیچارہ دل کیا کرے گا؟ آپ کے ہاتھ پاک نہیں، خون میں رنگے ہوئے ہیں تو پھر اپنے دل پر کس طرح کنٹرول کریں گے۔ خراب اعمال سے کس طرح بچیں گے؟ آج انسان انسان کو قتل کرتا ہے۔ جو شخص انسان کو مارتا ہے اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام، تعلیم اور تبلیغ کیا فائدہ دے گی؟ جب آپ کے غصہ کی حالت یہ ہے کہ پتھر اٹھا کر اپنے بھائی کے سر میں مار دیتے ہیں، گولی مار کر اسے جان سے ختم کر دیتے ہیں تو آپ کو خود بخود اندازہ ہونا چاہئے کہ آپ کے ذہن کی سطح اور پستی کی کیا حالت ہے؟

آپ کو اپنی نیت، ارادہ اور خواہشات کو قابو میں رکھنا چاہئے۔ اس بات کو یقینی بنانا چاہئے کہ آپ کا ذہن پاک ہے، اب آپ کی ذہنی سطح اور سوچ ناپاک نہ ہوگی۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس منزل پر آپ کیسے پہنچیں گے؟ جب

آپ اپنے خیالات اور جذبات پر کنٹرول نہیں کرتے تو آخر اس سوچ سے کیا فائدہ کہ اپنی مرضی اور خواہشات کی پاکیزگی کی بات کریں؟

یہ پورا عمل تدریج کے ساتھ حاصل ہوگا۔ آپ قرآن مجید کی اطاعت بھی اسی وقت کر سکتے ہیں جب مذکورہ بالا مراحل و منازل کو طے کریں۔ قرآن مجید اہل ایمان پر زور دیتا ہے کہ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (ترجمہ) اور تم نہ مرو مگر مسلمان ہو کر۔ سوال یہ ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا یہی مطلب ہے کہ جب ہم ایمان لائے ہیں تو ہمیں وہ کام کرنے ہیں جن کا اسلام ہمیں حکم دیتا ہے اور ہمیں اسلام پر ہی مرنا ہے، یعنی مرتے دم تک ان اعمال پر کاربند رہنا ہے۔ اس لئے مہربانی کر کے اپنی منزل کی جانب تیزی سے آگے بڑھیں، جس نصب العین کو آپ نے اپنایا ہے اسے سینے سے لگائے رکھیں۔ جو شخص مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے اس نے ارتقاء کی منزل حاصل کر لی، اب اسے چاہئے کہ وہ خود کو پاک رکھے اور توبہ کرتا رہے۔ موت سے پہلے ہی اپنی ابدی منزل مقصود کو حاصل کرنا ضروری ہے، یہی مسلمانی ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق عمل کرنا ہے۔ ذہنی لحاظ سے آپ کو تسلیم کرنا ہوگا، یہ اعتقاد رکھنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی جو مرضی ہے اس پر عمل پیرا ہونا ہے، اس کے مقابلے میں ذاتی اختیار اور مرضی نہیں چلے گی۔ اس بات کی پابندی کریں کہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی تعلیمات پر غیر شعوری طور پر نہیں بلکہ شعوری طور پر اور خود اختیاری سے عمل کرنا ہے، اسی کو نیت کہتے ہیں۔ ایک شخص سفر پر جانا چاہتا ہے۔ الکتاب کہتا ہے کہ آپ عازم سفر ہونے سے پہلے یہ سوچیں کہ آپ سفر پر کیوں جا رہے ہیں اور اس کا مقصد کیا ہے؟ زندگی سے موت کی طرف جو سفر جاری ہے، اس کے لئے بھی آپ کو سوچنا ہے۔ مجھے یہی کچھ عرض کرنا تھا۔ آپ کی مہربانی، آپ پر اللہ کی رحمت ہو۔

# راہ نجات

معزز ساتھیو اور دوستو! اگر میں بھول نہیں رہا تو اندازاً پانچ ماہ کے بعد ہم پھر یہاں اکٹھے ہو رہے ہیں۔ نئے سال کی تقریب کے بعد اس طرح کی خوشگوار فضا میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اجتماع معلوم ہوتا ہے۔ آج چند نئے چہرے بھی یہاں نظر آ رہے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہماری برادری میں کافی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ شاید ہمارے نئے ساتھیوں کے لئے یہ مجلس ان کی زندگی کا نیا تجربہ ہو۔

آج ہمارے اس طرح مل بیٹھنے کا باعث عید ہے، جو بار بار پلٹ کر آ رہی ہے۔ "عید" کے معنیٰ ہیں وہ چیز جو بار بار لوٹ کر آئے۔ بے شک ہمیں عید کی بہت زیادہ طلب رہتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کسی کو روزوں کی یاد بھی رہتی ہے؟ روزوں میں ہے تو بڑی مشقت اور تکلیف، مگر جب کبھی عید کا دن آتا ہے تو ہمیں آپس میں مل بیٹھنے کے ساتھ ساتھ روزوں اور قربانی کا سبق بھی یاد دلاتا ہے۔

یوں بھی روزہ خشکی، بھوک اور نفس کو تکلیف میں مبتلا کرتا ہے، جبکہ عید میں مزے ہی مزے ہیں۔ کھانے اور خوشیاں۔ اس لئے عید ہر ایک کو پسند آتی ہے، مگر روزوں کے ساتھ اکثر کی بنتی نہیں، کیونکہ کسی بھی اصول کی پابندی اور پاسداری کرنے والے لوگ کم ہوتے ہیں۔ روزے کا تو مفہوم ہی بندش یا روکنا ہے۔ تمام نفسانی خواہشات اور انسانی مرغوبات پر پابندی کا نام روزہ ہے، جس نے یہ پابندیاں بخوشی قبول کیں، درحقیقت اسی کیلئے عید سعید کی خوشی ہے جو بار بار پلٹ کر آتی ہے۔

غور کریں کہ صرف انسان ہی نہیں پوری کائنات پابندی کا فائدہ اور ثمرہ

Marfat.com

حاصل کرتی ہے۔ انسانوں میں سب سے پہلے یہ پابندی حضرت آدم و حوا علیہما السلام نے اختیار کی، جن کو جنت کے ایک درخت کا پھل کھانے کی ممانعت ہوئی تھی، ہر بات کا کچھ نہ کچھ مقصد ہوتا ہے اور مقصد کے بغیر کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوتی اور کامیاب ہو بھی کس طرح، جبکہ وہ حاصل اور نتیجے سے خالی ہو۔ مثال کے طور پر ہم سب ایک ادارہ میں کام کرتے ہیں، آخر کس لئے؟ ہمارا کوئی تو مقصد اور پروگرام ہوگا یا بغیر مقصد کے ہم آتے جاتے رہتے ہیں۔ یقیناً ہمارے سامنے ایک عظیم الشان مقصد ہے اور ہم ایک آہنی عزم کے ساتھ یہاں ہمہ تن مصروف ہیں، البتہ ہم اور آپ یہاں اپنے اپنے طریقے پر کام کر رہے ہیں۔ مجھے اور آپ سب کو اس مقصد کے لئے ایک مرکزی خیال کے تحت کام کرنا ہے۔ اگر اس اجتماعی نظریے کی بجائے ہم میں سے ہر ایک صرف یہ سمجھنا شروع کردے کہ میں تو صرف پٹیوالہ ہوں یا صرف کلرک ہوں، یا صرف رجسٹرار ہوں یا صرف وائس چانسلر ہوں تو یقیناً کام نہیں چلے گا اور وہ مقصد حاصل نہ ہوگا، جس کیلئے ہم یہاں کام کر رہے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ہم سب ایک مشین کے کل پرزے ہیں اور سب کو مل کر اس مہم کو سر کرنا ہے اور ایک ہی مقصد حاصل کرنا ہے۔ جب سب کی اجتماعی کوششوں سے کامیابی ہمارے قدم چومے گی، تب جاکر ہم انعام کے مستحق ہوں گے۔ ایسا انعام بامقصد کام کرنے والے کارکنوں کو فطری طور پر عطا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے کام کی نوعیت ہیچ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ملازم جو اپنی ڈیوٹی بخوشی ادا کرتا ہے، اپنے فرض ناشناس آقا سے بدرجہا بہتر ہے۔ اپنے کام میں کوتاہی نہ برتنے والا کلرک اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس افسر سے ہزار درجہ معزز اور قابل احترام ہے، جو ڈیوٹی صحیح طور پر انجام نہیں دیتا۔ دنیا کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ کتنے ہی معمولی حیثیت کے فرض شناس ملازم بعض اوقات اپنی فرض شناسی کی بنا پر اعلیٰ مناصب تک پہنچ گئے۔ کیونکہ انہیں آئین فطرت کے

Marfat.com

اٹل قانون کی پابندی کا انعام اور پھل مل کر رہا۔

افسوس اس بات کا ہے کہ آج ہمارے یہاں سے اسلامی روایات ختم ہوتی جارہی ہیں۔ صحیح اسلامی معاشرت یہی ہے کہ پہلے جید سے جید عالم بھی اپنا معاشی مسئلہ خود حل کرتے تھے۔ ان میں بے شمار لوگ ایسے تھے، جنھوں نے کوئی نہ کوئی پیشہ سیکھ کر اپنے لئے قوتِ لایموت کا انتظام کیا اور ملک وقوم میں علم کا نور پھیلاتے رہے۔ ان میں سے کوئی کوری تھا تو کوئی چمار۔ کوئی کپڑے دھونے کا کام کرتا تھا تو کوئی عطار تھا۔ چنانچہ عطار، حلاج، سقہ، بجاج ہماری بہترین ہستیوں میں سے ہیں۔ یہی معاشرت تھی جس میں ایک شیدی غلام ایک طرف ہوتا تو "طاؤس الحرمین" دوسری جانب ہوتا تھا۔ کیونکہ اس معاشرت میں قرآن مجید کا یہ زریں اصول کارفرما تھا کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (ترجمہ) تم سب میں بہترین آدمی وہی ہے جو زیادہ متقی اور پرہیز گار ہو۔ نیکی اور تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ جو کام کسی کے سپرد کیا جائے وہ اسے بحسن وخوبی انجام دے۔ قطع نظر اس امر سے کہ وہ کام معمولی نوعیت کا ہو یا بڑی اور بنیادی حیثیت کا۔ خواہ وہ کام دھوبی کا ہو یا سلطانئ جمہور کا۔ ڈیوٹی دینے والا پٹیوالہ ہو یا وائس چانسلر۔ بہرحال عزت واحترام کا حقدار وہی شخص ہے جو اپنی ڈیوٹی پابندی اور خوش اسلوبی سے ادا کرتا ہو۔ اگر کوئی شخص کہے کہ میں تو معمولی کلرک ہوں، میں اس سے بڑھکر اور کیا کرسکتا ہوں، تو وہ غلطی پر ہے۔ دراصل وہ نہایت ہی کارآمد کارکن ہے، بشرطیکہ اپنا فرض اچھی طرح ادا کرتا ہو۔ ہر ایک اس مشنری، اس ادارہ کا ایسا پرزہ ہے، جس کے بغیر کام چل نہیں سکتا۔

آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس ملک کی حالت زار کیا ہورہی ہے؟ ہے کوئی اس قوم میں انسانیت؟ ہر جگہ لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ چھوٹا ہو یا بڑا کوئی شخص اپنی ڈیوٹی ایمانداری سے ادا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ بجلی والوں کو کام

Marfat.com

کرنے کے لئے بلائیے تو وہ ایمانداری کی بجائے جعل سازی کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کچھ ناجائز طریقے سے فائدے حاصل کریں۔ ظاہر بات ہے کہ اس طرح آپ جس شخص کو اپنے مملکتی امور سرانجام دینے کے لئے چنتے ہیں، اگر وہ بھی اسی طرح ناجائز طریقے سے دولت اور مفادات حاصل کرنے کی فکر میں سرگردان ہو تو اس میں اور عام ڈاکو میں کیا فرق رہ جائیگا؟ جس طرح بجلی کا میٹر ریڈر چور ہے، ویسا ہی وقت کا حاکم بھی۔ اسی طرح اگر شاہ یعنی حاکم وقت دوسروں سے پیسے لے لے کر گذارہ کرے تو پھر شاہ و گدا میں فرق ہی کیا رہ جائیگا؟

پس بنیادی نکتہ یہی ہے کہ ہم میں سے جو، جس ڈیوٹی پر بھی مامور ہے، صفائی کرنے والے جاروب کش سے لے کر حاکم وقت تک، ہر شخص اپنی ذمہ داری اچھی طرح سے ادا کرے تو پھر وہ عزت و احترام کا لائق ہے۔ اور اگر کوئی اپنی ڈیوٹی میں خیانت کرتا ہے، یہاں تک کہ بادشاہ وقت بھی اپنے فرض کی ادائیگی صحیح طریقہ سے نہیں کرتا تو اس صورت میں وہ اس بھنگی سے بھی بدتر ہے جو اپنی ڈیوٹی پابندی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔

چنانچہ ہر مسلمان پر حلال رزق کا حصول فرض قرار دیا گیا ہے۔ **طلب الحلال فریضة علی کل مسلم** (ترجمہ) رزق حلال کی تلاش و جستجو ہر مسلمان پر فرض ہے۔ حلال کمائی سے مراد وہ رزق ہے جو آدمی اپنی صلاحیت کے مطابق سچائی اور محنت سے حاصل کرے۔

ساتھیو! آؤ ہم سب مل کر اپنے اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی مثالی درسگاہ بنائیں کہ پاکستان ہی نہیں پوری دنیا کو چیلینج کر کے ہم کہہ سکیں کہ یہاں کوئی ایسا کارکن نہیں جو خود کو صرف پٹیوالہ یا صرف کلرک یا صرف افسر سمجھتا ہو۔ ہم سب ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، جو مل کر ایک گھر کے افراد کی طرح. ایک

Marfat.com

مقصد کے حصول کے لئے صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے کام کر رہے ہیں۔

آئیے! ایک بار اکٹھے ہو کر دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کریں کہ اس ادارہ میں کوئی بھی ذمہ دار آدمی ایسا نہیں، جو بغیر کسی مقصد کے کام کرتا ہو۔ کوئی بھی ایسا خودغرض نہیں جو اس ادارے کے بلند مقاصد کی بجائے ذاتی مقاصد کی تکمیل میں مصروف ہے۔ کوئی ایسا سست اور کاہل موجود نہیں جو اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے بھرپور کام نہ لیتا ہو۔ اور کوئی بھی ایسا بدنیت اور مفاد پرست نہیں جو رزق حلال کی بجائے حرام کمائی کے راستے ڈھونڈھتا ہو۔ اگر ہم نے اپنی اس دعویٰ کو ایک بار سچا ثابت کر کے دکھایا تو انشاء اللہ، مددِ الٰہی ضرور ہمارے شامل حال ہوگی۔ اور ہم فطرت کے اس انعام کے مستحق ہو جائیں گے، جو فرض شناس اور محنتی لوگوں کو ہمیشہ ملتا رہتا ہے۔

یونیورسٹی کا مقصد ہے جامعہ کے علم کی روشنی کو عام کرنا اور دور دور تک اسے پہنچانا۔ یہ مقصد ہمیں اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب ہم مذکورہ بالا طریقہ پر عمل پیرا ہوں گے اور اسی وقت آپ صحیح معنیٰ میں استاد کہلا سکتے ہیں، ایسا کرنے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ پاکستان کی دوسری یونیورسٹیاں ہماری تقلید کرنے میں فخر محسوس کر رہی ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ جو بھی کام کریں، اس میں صرف للہیت شامل ہو، اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ دنیا بھر میں آپ کے ادارے کو کیا ممتاز اور بلند مقام حاصل ہوتا ہے؟ آپ جو کام بھی اللہ کی رضا اور خوشنودی کی خاطر کریں گے وہ عبادت میں شامل ہوگا۔ ایک بار حضرت عمرؓ خطاب فرما رہے تھے تو اذان کی آواز کانوں میں گونجی۔ ایک بدوی نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین! عبادت کیلئے منادی ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟ حقیقت میں عبادت وہی ہے جو آدمی جو کام بھی کرے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کرے۔ اسی بات کو شاہ عبداللطیف رحمتہ اللہ

Marfat.com

علیہ نے اس طرح فرمایا ہے کہ ایسے لوگوں کی نیند بھی عبادت میں شمار ہوتی ہے۔

عبادت کے اس مقصد کے سوا خود نماز کیا ہے؟ اس کا ہمیں ابھی تک علم نہیں۔ نماز تو چھوڑئیے، صرف نیت کا پہلا لفظ انی وجھت کا مقصد بھی کوئی سمجھتا ہے یا سمجھا سکتا ہے؟ سچی نیت یوں ہے: انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا (ترجمہ) بے شک میں نے اپنے چہرے کو اس ہستی کے لئے پھیر دیا، جس نے آسمان اور زمینوں کو پیدا فرمایا۔ اس کا مطلب سمجھنے پر ہی سب کچھ منحصر ہے۔ لیکن افسوس ہم نے ابھی تک صرف انی کا مطلب بھی نہیں سمجھا، پھر نماز کیا پڑھیں گے۔

بہرحال ایک سچا مسلمان بغیر مقصد کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاتا۔ اس کے برعکس موجودہ صورتحال میں کسی بھی مسلمان کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ عید ہر شخص منانا چاہتا ہے، لیکن عیدِ فطر کا مفہوم کسی کے بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور نہ ہی کوئی روزہ کی حقیقت جانتا ہے۔ اور نہ کوئی اچھے کالے کا فرق مد نظر رکھتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا کہ عید لفظ کی معنیٰ ہی ہیں، وہ چیز جو بار بار آئے۔ پس یہ عید دوبارہ آئے گی اور ہم انشاء اللہ پھر کٹھے ہوں گے۔ لیکن کاش! عید سعید کی واپسی ہمیں، الٰہی مقصد سے بھی ہمکنار کردے۔ اس وقت ہمارے ملک کی صورتحال ایسی ہے کہ یہاں زندہ رہنا بھی مشکل نظر آرہا ہے۔ یہی بڑی بات کہیے ہم گذشتہ چار برس سے زندہ ہیں اور الحمد للہ! کہ ہمارے ادارے کا خاتمہ نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے آج تک ہمیں صحیح سلامت رکھا اور اس جگہ اکٹھا کیا۔ جب تک عید واپس آئے۔ آئیے! اس وقت تک ہم اس بات کا عزم مصمم کریں کہ ہم اپنے چھوٹے سے ادارے کو اس عظیم نظام کے مطابق چلائیں گے اور سندھ کی اس یونیورسٹی کو ایک ایسی مثالی درسگاہ بنائیں گے جو

پوری دنیا کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو۔

آپ نوجوان ہیں اور آپ کی صلاحیتیں ابھی جواں ہے، آپ کے جذبات زندہ اور عزائم بلند ہیں، جن کے ذریعے آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ روپے پیسے کا بھوت اپنے دماغوں سے نکال دیں اور اس طریقے پر کام کرنا چھوڑ دیں، جس سے معلوم ہوتا ہو کہ آپ کی زندگی کا مقصد صرف پیسا کمانا ہے۔ اس قسم کے سارے جذبات دلوں سے نکالنے کے بعد ہی آپ اپنی یونیورسٹی کو دنیا کے سامنے ایک صحیح نظریہ رکھنے والے علمی ادارہ کی حیثیت سے پیش کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کا آپس میں باہمی ایسا تعاون اور تعلق ہو، جیسا مشین کے کل پرزوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر یقین رکھیں کہ جلد یا بدیر کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ اور آپ اس "مقام محمود" تک پہنچ جائیں گے، جس کا حصول ہر انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے۔

Marfat.com

# معلم کا کردار اور ذمہ داریاں

## تعلیمی ماہرین اور اساتذہ کے لئے قابل غور نکات

یہ صدارتی تقریر توسیعی لکچروں کے سلسلے کی کڑی ہے جو علامہ صاحب نے 18 دسمبر 1953ع کو سندھ یونیورسٹی کے سینیٹ ہال میں کی تھی۔ اس وقت پہلے مقرر محترم آغا تاج محمد تھے، جو سندھ یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔

خواتین و حضرات! ہماری یونیورسٹی کے رجسٹرار جنہوں نے آپ کو آج اچھے استاد کے اوصاف کے بارے میں بتایا۔ جیسا کہ موصوف نے کہا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ٹیکنیکل مضمون ہے، جو بالخصوص ان لوگوں سے تعلق رکھتا ہے جو تعلیم سے وابستہ ہیں، اس لئے اسے پروفیشنل مضمون کہا جاسکتا ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ یہ عام لوگوں کی دلچسپی کا باعث نہ ہو۔ اگرچہ ہم یہاں عام شہریوں کی شرکت کی بھی اتنی ہی امید رکھتے ہیں، جتنی طلبہ کی، بالخصوص ان طلبہ کی، جو یہاں یہ سیکھنے آتے ہیں کہ تعلیم کس طرح دی جائے؟ اس وجہ سے ایک اچھے معلم کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔ مگر آج کے موضوع کی حقیقی دلچسپی کی تاریخ بہت آگے ہے۔ ہم یہاں یہ حقیقت بار بار بیان کرچکے ہیں کہ بچے کا اولین استاد وہی ہے، جو اسے جنم دے کر دنیا میں لاتا ہے اور ایک لحاظ سے ایسا انسان خدائیت (Divinty) میں شرکت کرتا ہے اور ہم اس اہم کام کو آسانی کے ساتھ سرانجام دے سکتے ہیں۔ گذشتہ ہفتہ یہاں "ماں - بچے کی اولین استاد" کے

Marfat.com

موضوع پر تقریر ہوئی۔ اس لئے ماؤں کو خاص طور پر جاننے کی ضرورت ہے کہ صحیح استاد اور صحیح تعلیم کیا ہے۔ ان تمام باتوں سے بڑھ کر مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یاد آتا ہے جو بہت دلچسپ ہے، آپ فرماتے ہیں کہ الناس عالم و متعلم باقیها هماج" یعنی انسانیت دو حصوں پر مشتمل ہے، ایک استاد دوسرا طالب علم۔ باقی لوگوں کا انبوہ ہے، جو کسی شمار میں نہیں۔ ان کا فرض ہے کہ پڑھیں یا پڑھائیں لیکن اگر ان میں سے کسی طبقہ سے وابستہ نہیں تو پھر ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ آغا صاحب کا لکچر نہایت دلچسپ ہے اور کچھ نہیں تو انہوں نے ہمیں ایک ایسی الجھن میں ڈال دیا، جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ میں آغا صاحب سے عرض کروں گا کہ مجھے اس الجھن سے نکالنے میں مدد دیں۔ انہوں نے بہت سے نظریات (theories)، مثلاً ہیلن کیلر کے نظریہ تعلیم اور دیگر ماہرین کے نظریات کا حوالہ دیا، جن کو بیک وقت کوئی شخص یاد بھی نہیں رکھ سکتا۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس الجھن سے چھٹکارا پایا جائے۔

صحیح حقیقت یہی ہے، جیساکہ مسٹر آغا صاحب نے کہا کہ جدید دور کے انسان نے بہت سے نظریات ایجاد کر لئے ہیں۔ تعلیم کے بارے میں پچاس ہزار سال کے مقابلے میں گذشتہ ایک صدی میں کافی نظریات معرض وجود میں آئے، کیونکہ اب انسان زیادہ باشعور ہوگیا ہے۔ اس نے بتدریج سوچنا شروع کیا، بنا بریں تعلیم کے بارے میں کافی نظریات نے جنم لیا۔ اس کا ایک سبب اور بھی ہے۔ انسان نے گذشتہ کامیابی کے دور میں، جو دراصل مسلم دور کا ورثہ تھا، جس میں دوران تعلیم سزا کا اصول کار فرما تھا، جس کی بدولت بچے کو کم از کم بگاڑ سے بچایا تو جاسکتا تھا، سزا کے بل بوتے پر بچے کو کم از کم یہ سمجھایا جاتا تھا کہ یہ

Marfat.com

کام کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا۔ لیکن اب اس اصول کو ترک کر دیا گیا ہے۔ ہم بچوں کو کیا پڑھا رہے تھے اور کیونکر پڑھا رہے تھے؟ یقیناً ہم بچوں کو لکھنا پڑھنا، قرآن مجید سیکھنا اور زندگی گذارنے کے عمدہ قواعد اور قوانین سکھا رہے تھے کہ والدین، اعزہ اقارب، پڑوسیوں اور معاشرہ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے اور ان کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اس لئے سارے معاملات آسان تھے۔ سزا کے اس اصول کے ردّعمل میں دوسرے بہت سے نظریات وجود میں آئے اور مار کا فلسفہ ایسی جگہ چلا گیا کہ پھر کبھی نظر نہ آیا۔ اب استاد بالکل بے بس ہو کر رہ گیا، جسے یہ تک پتہ نہیں کہ کیا پڑھانا ہے اور کیا نہیں پڑھانا۔ اور وہ بچے کے سامنے صرف ہاتھ باندھ کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ بچو! اب تمہیں خود پڑھنا ہے۔ آج استاد اس حد تک جا پہنچا ہے۔ یہ اس خیال کا نتیجہ اور ردّعمل ہے کہ سزا دینا بے وقوفی ہے، نیز یہ کہ سزا کے بغیر آپ جو کریں گے اور جو بھی رویہ اپنائیں گے، اس کے ذریعے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ رد عمل فطری اور مناسب تھا اور انسان نے سوچنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ سوچ گہری نہیں سطحی تھی۔ چنانچہ اس طرح کے کوتاہ بیں ماہرین تعلیم نے بہت سے سطحی تعلیمی نظریات تخلیق کیے۔

سوال یہ ہے کہ آخر تعلیم کیا ہے؟ یہاں چھوٹے بچے یا بڑے بچے کی بحث کو چھوڑیں۔ آخر میں اس بارے میں اتنا زیادہ سنجیدہ کیوں ہوا کہ لندن تک کتابیں چھان ماریں، اساتذہ اور ماہرین تعلیم سے یہ سوال کرتا پھرا اور اس بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ مجھے انگلینڈ کی ایک بہترین شخصیت نے بتایا کہ ہمیں ابھی تک تعلیم کے فلسفہ کا ادراک نہیں۔ یہ جواب لندن کے ایک پروفیسر صاحب نے بیس برس کی مسلسل تحقیق و جستجو کے بعد مجھے ذاتی طور پر دیا۔ انہوں نے کہا کہ محترم! ہمارے ہاں ابھی تک تعلیم کا کوئی فلسفہ ہی نہیں ہے اور یہی سب سے بڑی مشکل ہے۔

Marfat.com

پس سوال درپیش یہ ہے کہ تعلیم کا فلسفہ ہمیں کیا چیز مہیا کرتا ہے، جس کے بارے میں محترم پروفیسر صاحب کا کہنا تھا کہ وہ ابھی تک ہم حاصل نہیں کر پائے۔ یہی نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ اس کا تجزیہ کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ تعلیم کے معنیٰ ہیں باہر نکالنا۔ لہذا اگر آپ کسی کی رہنمائی کرتے ہیں تو فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرف اس کی رہنمائی اور دستگیری کر رہے ہیں؟ لامحالہ کوئی نہ کوئی منزل تو ہوگی جس کا ادراک اور شعور لازمی ہے۔ آپ انسانی نسل کی رہنمائی کر رہے ہیں تو پھر بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ ان کی کس طرف رہنمائی کر رہے ہیں؟ جنت کی طرف یا جہنم کی طرف؟ اچھائی کی طرف یا برائی کی طرف؟ آخر ہدف اور منزل کیا ہے؟

اس لئے جس استاد کو منزل مقصود کا ادراک و شعور نہیں کہ طلبہ کی کس طرف رہنمائی کر رہا ہے تو وہ استاد ہی نہیں۔ ایک فارسی شاعر کہتا ہے کہ:

آنکہ خویشتن گم است کرا رہبری کند؟

یعنی جو شخص خود گمراہ ہے وہ کسی کی کیا رہنمائی کرے گا؟

دوسرا شاعر کہتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ: بیٹے! محنت و کوشش کر کہ آخر تو ایک دن باپ بنے گا۔ جب تجھے راستہ کا ہی پتہ اور علم نہیں تو کس طرح دوسروں کی رہنمائی کر سکے گا؟

میں عرض کر رہا تھا کہ مجھے عالم و فاضل انگریز پروفیسر نے بتایا کہ ہمیں ہنوز تعلیم کا فلسفہ معلوم کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ انسان کی منزل کیا ہے؟ وہ اس دنیا میں کیوں آیا؟ ہماری زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟ اور ہماری کس طرف رہنمائی ہونی چاہئے؟ جب مقصد زیست کا ادراک اور شعور نہ ہو تو ظاہری تعلیم بے فائدہ ہو جائے گی اور ایسی تعلیم ناقص ہی ہوگی۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اچھا بنیں، اخلاق عالیہ سیکھیں، ماں باپ

Marfat.com

سے حسن سلوک سے پیش آئیں۔ یہی تعلیم کا مقصد ہے اور یہ وہ یقینی اور اصل، حقیقت ہے جو آپ کے لئے ناگزیر ہے۔ جو شخص دنیا میں تمہارے وجود کا ذریعہ ہے، اس بوڑھے کے سامنے درشت اور نامناسب لہجے میں بات مت کریں۔ اس طرح کی اخلاقی تعلیم کے بعد بچوں کو مزید اچھے اصولوں کی تعلیم دینا ضروری ہے۔

یہ فطری بات ہے کہ کانٹوں کے درخت میں انجیر پیدا نہیں ہوا کرتے۔ کیا آپ میں سے کوئی بھی ماہر نباتات ایسا کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ عام کہاوت ہے کہ کانٹوں سے انجیر پیدا نہیں ہوتے۔ اس لئے موروثی اشیاء کا اثر بھی ہوتا ہے۔ انسان کی نشوونما اسی طرح ہوگی جس طرح وہ پیدا ہوا ہے۔ اس کے اندر جو موروثی خصوصیت ہے اس کے ماتحت ہی وہ نشوونما پائے گا۔ مگر ہم صرف اسی پر انحصار نہیں کرتے۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان ذات ازل سے وہی چلی آرہی ہے۔ ہم انسانیت کی عام فطرت کے بارے میں بھی کچھ جانتے ہیں۔ ہم انسان کے عام رجحان اور اخلاق کے بارے میں بھی جانتے ہیں، ہم اسے اسی حالت میں نہیں چھوڑتے، بلکہ اس کی فطری ترقی بھی چاہتے ہیں۔

درخت کو اس کی فطرت اور صلاحیت کے مطابق بڑھنے دیں۔ سورج اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور وہ سورج کی طرف جھکتا ہے۔ ہوا درخت کو جھکا دیتی ہے اور وہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ پھر آپ اسے سیدھا کرنے کے لئے سہارا دیتے ہیں۔ اگر وہ ایک طرف جھک جائے تو درخت کی حفاظت کرنے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے سیدھا قائم رکھنے کی کوشش کرے تاکہ وہ اپنا قد وقامت برقرار رکھے اور خوراک حاصل کر کے پھل دے۔ یہ سب باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ ہم درخت کی فطرت کو بدل نہیں سکتے، کیونکہ وہ درخت ہی رہے گا، مگر ہم اس کی نشوونما میں مدد دے سکتے ہیں تاکہ وہ اچھی سے اچھی حالت میں بڑھتا جائے اور عمدہ سے عمدہ پھل پیدا کرے۔ یہ سب باتیں ممکن ہیں۔ اب جو ان (ماہرین تعلیم) نے

سوچا کہ بچہ خود بخود آگے بڑھتا ہے، در حقیقت یہ نظریہ بھی ایک رد عمل ہے، اُس نظریہ کا کہ پہلے سوچا جاتا تھا کہ بچے کو جس طرح بھی چاہیں اسی طرح تیار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ دونوں نظریات غلط اور افراط تفریط کا شکار ہیں۔ اس وقت بہت سے نئے تعلیمی نظریات وجود میں آچکے ہیں، چنانچہ ہم الجھ جاتے ہیں کہ کس طرف چلنا چاہیئے؟ نظریات کا ایک لامتناہی جنگل ہے، جہاں سے کسی منزل کا کوئی پتہ نہیں لگتا، یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس نظریہ تعلیم کو اختیار کیا جائے اور کس کو اختیار نہ کیا جائے؟ یہ جدید دور کی بڑی مشکل ہے۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ بدستور قائم ہے کہ بچے کی اصلاح کی جائے۔ بچہ اس شخص کا اثر لیتا ہے جو اس کی تربیت اور پرورش کرتا ہے۔ اب اگر تربیت کرنے والا ہی چور یا ٹھگ ہے یا کسی اور بداخلاقی میں مبتلا ہے تو بچہ اس کی یہ ساری بداخلاقیاں سیکھے گا اور اس کا اثر لے گا۔ بچے میں چند موروثی خصوصیات ہوتی ہیں، جن کی باسانی اصلاح ہوسکتی ہے۔ اس لئے ابتدائی دور میں تعلیم کو دو مراحل میں تقسیم کیا گیا۔ ایک کو تربیت اور دوسرے کو تادیب کہا گیا۔ ایک مرحلہ پر استاد نے سوچا کہ بچہ ابھی چھوٹا ہے، اس عمر میں اسے مارنا نہیں چاہیئے، اسے شفقت اور محبت سے تعلیم دینی چاہیئے۔ جب بچہ کچھ بڑی عمر کا ہوجاتا ہے اور اس کے اندر خراب عادتیں اور مزاج کی کجی پیدا ہوتی ہے تو مجبوراً سوچنا پڑتا ہے کہ اب اس کی گوشمالی کرنی چاہیئے، جسے "تادیب" کہا جاتا ہے۔ اس مرحلہ پر بچے سے کہا جاتا ہے کہ یہ خراب عادتیں ہیں ان سے احتراز کرو، چھٹکارا حاصل کرو۔ طلبہ میں ان تمام چیزوں کا جو ان کو ورثے میں ملتی ہیں، یہاں تک کہ موروثی بیماریوں تک کا بھی لحاظ کرنا چاہیئے۔ اگر بچے کو سانس کی بیماری ہے تو ڈاکٹر کو دکھانا اور علاج معالجہ کرنا پڑتا ہے، تاکہ اس کی بیماری ختم ہوجائے۔ اسی طرح اخلاقی بیماری کا

Marfat.com

بھی علاج کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً شرابی یا چور کا بچہ، جب بچہ اپنے باپ کو شراب پیتا یا چوری کرتا ہوا دیکھتا ہے تو اس میں اس خراب عادت کا لازماً اثر پیدا ہوتا ہے، اس کا بھی علاج کرنا ضروری ہے۔ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھ کر ان کا حل تلاش کرنا اور سزا دینا ضروری ہے۔ بچے کی خراب عادت کو ختم کرنا ضروری ہے، اس کے لئے کچھ نہ کچھ سختی سے کام لینا پڑتا ہے، جس کے لئے میں کہا کرتا ہوں کہ ضابطہ ضروری ہے۔ سختی ہر وقت اچھے نتائج نہیں لاتی مگر کبھی کبھار معمولی سختی بھی بڑی کار آمد ثابت ہوتی ہے۔

ہمیں نفسیات کے بڑے بڑے ماہرین بتاتے ہیں کہ ساٹھ سال سے زیادہ عمر کے مریضوں کے علاج کے لئے جھٹکوں کا طریقہ علاج ضروری ہے۔ اب جھٹکوں کے طریقہ علاج سے کیا مراد ہے؟ یہی نا کہ اسے اس طرح جھٹکے دیے جائیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح نیند سے بیدار ہو کر، کام اور محنت کرے اور آگے بڑھے۔ بالکل اسی طرح بچے کے اندر جو موروثی یا معاشرتی بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں، ان کو تادیب کے طریقے پر ختم کرنا ہے۔

اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ اس معاملہ میں انتہاپسندانہ رویہ ہماری معاونت کیوں نہیں کرتا۔ ہمیں زندگی کے مقصد کے بارے میں سوچنا چاہیئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ جب استاد کو منزل کا شعور نہ ہو تو پھر وہ بچے کی تربیت کیسے کرے گا؟ ایسا شخص صحیح معنوں میں استاد نہیں ہو سکتا۔ صحیح استاد کو خود کسی نہ کسی حد تک منزل کا احساس اور شعور ہونا چاہیئے۔ اسے یہ جاننا چاہیئے کہ انجیر کا درخت کتنی مدت تک نشوونما حاصل کرنے کے بعد پھل دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے طریقے کے مطابق بڑھے گا، اس وقتِ مقررہ سے پہلے ہم اسے بڑا نہیں کر سکتے۔ یہ وہ حقائق ہیں جو ایک معلم کو جاننے چاہئیں کہ کس طریقے سے اشیاء کی اصلاح کی جا سکتی ہے، مگر ہم حقیقت کا شعور و احساس ہی نہیں رکھتے۔ اگر ہم

Marfat.com

چاہیں توان کو قائم نہیں کر سکتے اور نہ ہی ختم کر سکتے ہیں۔

اب میں آپ کو ایک اور مثال دیتا ہوں۔ ایک شخص دیکھتا ہے کہ بچہ بھوکا ہے تو وہ کیا کرے گا؟ وہ اس کے لئے کھانے کا انتظام کرے گا۔ کیونکہ بچہ کی اولین ضرورت کھانا پینا ہے۔ میں اس حقیقت کو اکثر بیان کرتا رہتا ہوں کہ انسانی جسم کی طرح اس کے ذہن کا بھی ایک وجود ہے۔ ذہن کو بھی غذا کی ضرورت ہے۔ جسم کی طرح وہ بھی خوراک کا متقاضی ہے۔ جسم کی مانند وہ بھی اسی طریقے سے نشوونما حاصل کرتا ہے۔ ایک مثالی استاد کو اس ساری ذہنی کیفیت کو مد نظر رکھنا پڑتا ہے کہ بچے کو کس طرح کی ذہنی غذا کی ضرورت ہے۔ اس کی ذہنی سطح کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے گذشتہ دنوں بھی کہا تھا کہ اگر چھوٹے بچے کو گائے کا گوشت کھلایا جائے گا تو وہ ہضم نہیں کر پائے گا اور بیمار ہو جائے گا۔ اگر کسی بوڑھے آدمی کو، جس کے دانت بھی نہ ہوں، سپاری جیسا سخت کھانا کھلایا جائے گا تو وہ اسے ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ سب باتیں فطری ہیں۔ استاد جب تک ان فطری تقاضوں اور ضروریات کا ادراک نہیں کرے گا، اس وقت تک وہ بعض قواعد و قوانین کے تحت صحیح معنوں میں استاد نہیں ہوسکتا، خواہ ایسا استاد اور معلم کتنا ہی خدا پرست اور متقی کیوں نہ ہو اور حبِ دنیا سے بھی محفوظ ہو، جواری اور شرابی بھی نہ ہو۔ دراصل یہ اوصاف صرف استاد سے ہی نہیں بلکہ عام انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب بڑی عمر کے لوگ کوئی روش اختیار کرتے ہیں تو لامحالہ بچے پر اس کا اثر پڑتا ہے، لہذا ہمیں اس کام کو بہت اہم سمجھ کر کرنا چاہیئے، خداخوفی سے کام لینا چاہیئے۔ مذکورہ بالا اچھے اخلاق و اوصاف کو اپنانا چاہیئے، نہ صرف بحیثیت ایک استاد کے بلکہ ایک عام انسان ہونے کے ناطے بھی ان چیزوں کو اختیار کرنا لازمی ہے۔ اگر کوئی استاد ان اوصاف سے متصف نہیں تو پھر اس کے نہایت تباہ کن نتائج نکلیں گے۔ کیونکہ یہ فطری بات ہے کہ

Marfat.com

چھوٹے بچے اپنے استاد کے کردار سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں، پس آپ سمجھ سکتے ہیں کہ استاد کے منفی اخلاق کا نتیجہ بچوں میں کس قدر تباہ کن اثرات پیدا کرے گا؟ حاصل کلام یہ کہ استاد کی یہ دوہری ذمہ داری ہے کہ وہ بہترین استاد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہترین انسان بھی ہو۔ مجھے شیخ سعدی کی یہ چھوٹی سی کہانی یاد آتی ہے جو انہوں نے گلستان میں لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک شہزادہ ہمیشہ استاد کے ہاتھوں پٹتا تھا۔ ایک دن اس شہزادے نے اپنے باپ سے شکایت کی کہ ابو! مجھے استاد بہت مارتا پیٹتا ہے، جبکہ دوسرے بچے بھی وہی غلطیاں کرتے ہیں، پھر آخر وہ مجھے زیادہ کیوں مارتے ہیں؟ بادشاہ سلامت نے یہ سن کر استاد کو بلوایا اور حقیقت حال معلوم کی۔ استاد نے کہا کہ واقعی میں آپ کے بچے کو زیادہ مارتا ہوں، کیونکہ اگر آپ کا بچہ بگڑے گا تو پورا ملک خراب اور فساد زدہ ہو جائے گا، اس لئے مجھے اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر غریب کا بچہ بگڑا تو وہ زیادہ سے زیادہ صرف خود کو نقصان پہنچائے گا۔ چونکہ وہ سزا کا زمانہ تھا، اس لئے اس کا استعمال عروج پر تھا۔ کیونکہ استاد کی سختی جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، باپ کی شفقت سے زیادہ کارآمد و مفید ہوا کرتی ہے۔

- پہلے دوران تعلیم سزا کا اصول کارفرما تھا، اس کا استعمال عروج پر تھا اور اس میں خلوص نیت اور جذبہ خدمت شامل تھا، اسی بنا پر میں یہ فارسی مصرعہ دہرایا کرتا ہوں کہ:

سختیٔ استاد ز مہر پدر کارآمد بود

یعنی استاد کی سختی باپ کی شفقت سے زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔

تاہم ان تمام باتوں کے لئے وقت مقرر ہے۔ اس کا موسم ہوتا ہے۔ کبھی محبت سے سمجھانا مفید ہوتا ہے اور کبھی سختی کارگر ثابت ہوتی ہے۔ پس استاد کو انسانی فطرت اور اس کے بنیادی تقاضوں کا ادراک اور شعور ہونا چاہئے۔ ہر علاقے

اور ملک کے بچوں کی ضروریات اور ذہنی کیفیات سے آگاہی رکھنا لازمی ہے۔ پاکستانی بچے کی کیا خصوصیت اور ضرورت ہے؟ امریکی اور برطانوی بچہ کی کیا ضرورت ہے؟ استاد کا فرض ہے کہ محل و موقعہ کی مناسبت سے ہر بچے کی افتاد طبع، وقت کی نزاکت اور خاص حالت کے پیش نظر اس کی رہنمائی کرے۔ استاد کو معاشرہ، انسانی فطرت اور اس کی حقیقی ضروریات کے بارے میں ادراک ہونا چاہئے۔ ممکن ہو تو اسے انسانی زندگی کے مقصد کا شعور بھی ہونا چاہئے کہ انسان کیوں پیدا ہوا ہے؟ کس طرف جارہا ہے؟ اسے کیا کرنا ہے؟ اور وہ کس لئے پیدا کیا گیا ہے؟ جب تک اسے یہ علم نہ ہو، اس وقت تک وہ صحیح معنیٰ میں استاد نہیں ہوسکتا۔ جیساکہ آغا صاحب نے کہا: اس صورت میں وہ کسی کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف نہیں لے جاسکتا۔ یہ بات اس کے لئے ناممکن ہے، کیونکہ وہ خود اندھیرے میں ہے، کسی کی وہ رہنمائی کس طرح کرسکتا ہے۔"

کوئی زمانہ تھا کہ لوگ اساتذہ سے رہبری کے بارے میں مایوس اور ناامید تھے۔ انہوں نے سوچا، جیساکہ میں نے پچھلی تقریر میں بھی کہا:

ما مرید انیم بخدا　　　　رہبرِ ما خدائے ماست

یعنی جب لوگوں کو کوئی رہبر نظر نہ آیا تو وہ کہنے لگے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے طالب ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی ہمارا ہادی و رہنما ہے۔ وہی ہمیں اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے، جیساکہ اس نے وعدہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک زمانہ تھا جب انسانی معاشرے میں کوئی رہنما پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ملکوں اور قوموں میں الجھنیں اور مشکلات پیدا ہوتی گئیں، کیونکہ صحیح اساتذہ کا زبردست فقدان اور بحران تھا۔ چند ایک صحیح معنیٰ میں استاد تھے، لیکن اکثر کو یہ علم نہ تھا کہ نئی نسل کی تربیت کس طرح کی جائے؟ اس طرح کے اساتذہ کیا پڑھاتے؟ ایسے الجھے ہوئے ماحول میں انسان اس عظیم ہستی سے دعا مانگنے لگا، جس نے

Marfat.com

اسے پیدا کیا۔ اس نے دعا کی: اے اللہ! میری رہنمائی فرما۔ یہاں کوئی بھی رہنمائی کرنے والا نہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اکثر ایسا ہوتا رہا ہے۔ تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے۔ صحیح اساتذہ کی عدم موجودگی تاریخ میں نئی بات نہیں اور متعدد ممالک، مختلف قوموں اور مختلف ادوار میں اساتذہ کی ہمیشہ کمی رہی ہے، کیونکہ "استاد" ہونا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ بڑی ذمہ داری کا منصب ہے۔ لیکن ہمیں تعلیم کے خدائی نظریات کی طرف دیکھ کر گھبرانے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں جب ایک استاد تعلیم کے بارے میں سارے نظریات پڑھتا ہے تو عدم توازن کا شکار ہوجاتا ہے، وہ پریشان ہونے لگتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ صحیح فیصلہ کرنا اس کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے کسی کو گہرے پانی میں پھینک کر کہا جائے کہ وہ خود کو بھیگنے سے بچائے رکھے۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ استاد اگر واقعی اور صحیح معنیٰ میں استاد ہے تو وہ کنول کے پھول کی طرح ہوتا ہے، جو زمین میں پیدا ہوتا اور پانی میں کھلتا نظر آتا ہے۔ استاد کو سکھانے اور طالب علم کو سیکھنے کا سلیقہ آتا ہے۔

استاد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ خود کو بڑا نہ سمجھے، دوسری طرف طالب علم کا بھی فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ استاد کی عزت کیے بغیر کچھ حاصل نہ ہوگا۔ طالب علم جب استاد کو عملاً کچھ کرتا دیکھتا ہے تو بہت کچھ سیکھتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ہپناٹزم انسان پر نیند کی کیفیت طاری کر دیتی ہے، جبکہ وہ اس کی مرضی کے خلاف چلے۔

تعلیم کے بارے میں نئے نظریات قائم کرنے والوں نے کم از کم ایک خوبی تو معلوم کر ہی لی ہے یعنی یہ کہ موجودہ معاشرے میں استاد کی عزت اور تکریم ختم ہو چکی ہے اور جب تک معاشرے سے یہ خوبی غائب رہے گی، اس

وقت تک سیکھنے سکھانے کی امید بھی غائب اور نقش بر آب ثابت ہوگی۔

انسان کسی شخص کو کس طرح سکھا سکتا ہے؟ اس کے لئے پہلے زمانے میں لوگ اپنے مرشد کے پاس جایا کرتے تھے، مرشد ان کو بعض عجیب باتوں پر عمل کرنے کے لئے کہتے تھے، جن پر وہ عمل پیرا ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں، میں آپ کو ایک مثال سناتا ہوں: کہتے ہیں کہ ایک مالدار آدمی کسی بزرگ کے پاس گیا اور کہا کہ حضور! میری رہنمائی کریں۔ انہوں نے کہا کہ آپ بڑے لوگ ہیں، آپ حضرات کو رہنمائی کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس لئے گھر جا کر اپنے مال متاع کی نگرانی کریں، اس نے کہا کہ نہیں حضور! میری اصلاح و تربیت کے لئے ضرور کوئی عمل بتائیں۔ بزرگ نے کہا کہ اچھا ٹھیک ہے، یہ مسجد ہے، جہاں ہم نماز پڑھتے ہیں، بارہ مہینے تک وضو کے لئے کنویں سے پانی نکالتے رہیں، اس عمل کے بعد تمہاری مزید رہنمائی کروں گا۔ اس شخص نے کہا کہ حضور! یہ تو بہت مشکل کام ہے، یعنی یہ کام مجھ سے نہیں ہوسکتا۔

آج یہی حالت آپ کی بھی ہے۔ آپ کے اندر بہت غرور اور تکبر پیدا ہوگیا ہے۔ آپ نے اپنے لئے ایک آئیڈیل اور تصور بنالیا ہے۔ جو بیماری آپ کو لاحق ہے، آپ مجھے اس کے علاج کے لئے کہتے ہیں، مگر علاج کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ آپ ڈاکٹر کو طلب کرتے ہیں، مگر پرہیز کرنا نہیں چاہتے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے الفاظ میں پرہیز بھی نہیں کرتے اور ڈاکٹر کے مشورے پر عمل پیرا بھی نہیں ہوتے، کیا یہ طریقہ درست ہے؟ ہرگز نہیں! آپ کو ہر حال میں ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر آپ سے کہتا ہے کہ آپ کو نمونیا ہے، باہر نہ نکلیں، مگر آپ کا جو طرز عمل ہے، اس کے مطابق زبان حال سے آپ کہتے ہیں کہ میں تو ابھی گرم کپڑوں کے بغیر باہر نکلتا ہوں، دیکھتا ہوں مجھے کیا ہوتا ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ اس طرز عمل کا نتیجہ کیا نکلے گا، اس لئے ڈاکٹر

Marfat.com

سے مشورہ کریں، خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ پھر یہ بات بھی ضروری ہے کہ جب ایک بار آپ کوئی ڈاکٹر منتخب کرلیں تو اس کا کہا مانیں۔ اسی طرح جب آپ کسی کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ میرا استاد ہے تو ضروری ہے کہ اس کا حکم مانیں اور اس کے آگے سر تسلیم خم کریں۔ زیادہ نہیں تو کم از کم کچھ عرصے کے لئے ہی سہی۔ مگر افسوس! آج عملی صورتحال یہ ہے کہ آپ ایک منٹ کے لئے بھی اس کی ہدایات پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں۔ آپ صرف یہ سوچتے ہیں کہ چونکہ میرا باپ اسے ٹیوشن فیس یا تنخواہ دیتا ہے، یہی کافی ہے۔ ایسی حالت میں آپ کیا سیکھیں گے؟ ہمارے معاشرے کی یہی وہ بنیادی خرابی اور بیماری ہے، جس کی وجہ سے ایک تو تعلیم کے بارے میں بہت سے نظریات نے جنم لیا، دوم ہم نہ استاد کی عزت کرتے ہیں اور نہ کچھ سیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے جب تک یہ سوچ جاری و ساری رہے گی، اس وقت تک سیکھنے اور سکھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، صرف نوجوانوں کا ایک انبوہ کثیر تعلیمی اداروں سے فارغ ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔

اس لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ استاد کی عزت و احترام کی جائے، اس کی فرمانبرداری کی جائے۔ اپنے اندر وہ اوصاف اور خوبیاں پیدا کریں۔ استاد کو بھی یہ شعور ہونا چاہیئے کہ وہ کیا سکھا رہا ہے اور استاد کس چیز کا ہے اور کس مقصد کے لئے سکھا رہا ہے۔ بچے کی منزل کونسی ہے؟ اسے ایک حد تک انسانی زندگی کی منزل کا بھی شعور ہونا چاہیئے، تب جا کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایسا استاد یا ایسا تعلیمی ادارہ نظریہ تعلیم اور فلسفہ تعلیم کا حامل ہے۔ ورنہ تعلیم بغیر نظریے اور بغیر فلسفے کے ہوگی، جیساکہ اوپر میں نے لندن یونیورسٹی کے پروفیسر کا حوالہ دیا کہ ہمارے یہاں فلسفۂ تعلیم کا فقدان ہے، کیونکہ حقیقی منزل کا شعور اور احساس موجود نہیں، جب اس حقیقت کی آگہی اور احساس پیدا ہوگا، تب جا کر ہم دوسروں

Marfat.com

کی رہنمائی اور دستگیری کے قابل ہوجائیں گے۔ اس وقت ہم اندھیروں میں ٹومک ٹائیاں مار رہے ہیں، اس موقعے پر ایک آخری بات عرض کرنا چاہتا ہوں، جو کارلائل نے ایک سو سال پہلے کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ترقی کرنی ہے تو پھر کسی بہانہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ کارلائل کہتا ہے کہ لوگ میرے پاس آتے اور کہتے ہیں کہ آپ پہلے ہمیں یہ بتائیں کہ کس طرف چلنا ہے تو ہم چلیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ لوگوں کا یہ رویہ ترقی کی راہ میں مدد و معاون ثابت نہیں ہوسکتا، اس کا کہنا ہے کہ اندھیری رات میں بھی، جب چاند اور ستاروں کی روشنی تک نہ ہو، تو بھی آدمی ہمت کر کے اگر ایک قدم اٹھائے تو آگے بڑھنے کے لئے راستہ خود بخود صاف ہوجاتا ہے۔

(نوٹ: معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریر کا ابتدائی اور آخری حصہ کیسٹ کی خرابی کی وجہ سے ادھورا رہ گیا ہے۔)

Marfat.com

# لازمی تعلیم

خواتین و حضرات! آپ کے سامنے ماہر پروفیسر صاحب نے اپنا سیاسی، سائنسی اور معاشرتی نقطۂ نگاہ بیان کیا۔ اور یہ بھی بتایا کہ تعلیم کو عام اور لازمی کس طرح کیا جائے۔ آج کی تقریر کا موضوع ایک لحاظ سے کراچی کی اہم کانفرنس سے مشابہت رکھتا ہے، جہاں عالمی سائنسی کانفرنس ہو رہی ہے۔ جس میں متعدد ملکی و غیر ملکی اہم شخصیات اس مقصد کے تحت حصہ لے رہی ہیں کہ پاکستان اور دیگر ممالک میں علم کی روشنی کو عام کس طرح کیا جائے، اس بارے میں بڑے بڑے سائنسدان اور دانشور نہ صرف بحث کر رہے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی ٹانگ بھی کھینچ رہے ہیں۔ ہمارے سابق وزیر اور موجودہ پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن صاحب ممتاز مفکر اور ممتاز علمی شخصیت ہیں، جن کے بیانات ہم اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ پاکستانی قوم تعلیم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ موصوف نے اس سلسلے میں لوگوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی، یوں ایسی حقیقتیں سامنے آتی رہتی ہیں جو آپ کو سوچنے کا موقعہ فراہم کرتی ہیں، اس سلسلے میں ہم یہاں چھوٹے ہال میں بات کر رہے ہیں، جبکہ بڑے لوگ بڑے ہال میں گفتگو کر رہے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ بڑے لوگ بعض ایسی باتیں بھی کر جاتے ہیں جو مضحکہ خیز ہوتی ہیں، اس بار بھی ایسی ہی قابل استہزاء بحث چل رہی ہے۔

اس سلسلے میں ہم نسبتاً چھوٹی سطح پر، بالکل چھوٹے بچے یا دیہاتی ناخواندہ آدمی کی سطح کے مطابق غور کرتے ہیں کہ لازمی تعلیم کیا ہے۔ ایک بار مجھے "لازمی" لفظ نے بڑا الجھایا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ تعلیم بچوں پر لازم ہے یا والدین پر؟ میں سوچتا تھا کہ اگر یہ تعلیم بچوں پر لازم ہے تو پھر تعلیم کے بارے

Marfat.com

مین وہ تمام نظریات، بالخصوص وہ نظریات جو میں نے بچپن میں سیکھے تھے، غلط ہوجاتے ہیں، کیونکہ جب میں پانچ برس کا تھا تو مجھے کتاب پڑھائی گئی۔ وہ کتاب میں نے معنیٰ کے بغیر رواں پڑھی۔ اس میں عام تعلیم کے بارے میں کوئی بات نہ تھی، بلکہ اس کے برعکس یہ الفاظ ہم سنتے رہتے ہیں: لا اکراہ فی الدین (ترجمہ) دین میں کوئی جبراور زبردستی نہیں۔ یہاں میں نے اس حقیقت کو بار بار دہرایا ہے کہ علم ہمیں اندھیرے سے روشنی کی طرف لاتا ہے۔ لیکن لا اکراہ فی الدین کا نظریہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ پہلے اس عقدہ کو حل کرنا چاہیئے۔ تعلیم کا مطلب ہے تاریکی سے روشنی کی طرف آنا، لیکن اس کے ہر پہلو پر لا اکراہ فی الدین حاوی ہے۔ اس لئے "لازمی" کا لفظ مجھے کافی عرصے سے مجبور کررہا ہے کہ میں یہ سوچوں کہ یہ تعلیم کس پر لازمی ہے؟ انگلینڈ میں والدین پر لازمی ہے کہ اولاد کو پڑھائیں۔ میں آپ سے بھی پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ والدین کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے بچے کو تعلیم دے۔ میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جمہوریت پسند انسان ہیں۔ اگرچہ ہمارے قابل پروفیسر صاحب نے ابھی ہمیں بتایا کہ جب تک تعلیم کا کلی نفاذ نہ ہو، اس وقت تک جمہوریت بے بنیاد ہے۔ اس بات کو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ جمہوریت کے معنیٰ ہیں، عوام کی حکومت۔ اس سے اگر ان لوگوں کی حکومت مراد لی جائے جن کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے: اکثرھم لا یعقلون یعنی جاہلوں کی حکومت تو اس کا کوئی مشورہ نہیں دے گا۔ اگر آپ عقلمندوں اور بیدار دماغ لوگوں کی حکمرانی چاہتے ہیں تو بے وقوفوں کو پڑھانا پڑے گا۔ اس لئے پروفیسر صاحب کے قول کے مطابق جاہلوں کو حکمرانی کرنے کا حق نہیں۔ میں اس میں اتنا اور اضافہ کروں گا کہ جب تک انسان تعلیم حاصل نہیں کرتا، اس وقت تک اسے زندہ رہنے کا حق ہی نہیں۔ حکمرانی کرنا تو دور کی بات ہے، بلکہ میں یہ

Marfat.com

بھی کہتا ہوں کہ انسان انسان نہیں رہتا اور جب تک وہ علم حاصل نہ کرے اس وقت تک وہ مثل حیوان ہے، یوں لازمی تعلیم کا تصور وجود میں آتا ہے۔

بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو اس پر دباؤ نہیں ڈالا جاتا اور پڑھنے کے لئے اسے مجبور نہیں کیا جاتا۔ آپ کو مانٹیسری نے بتایا کہ چھوٹے بچوں کو کس طرح پڑھایا جائے؟ اور ان کے لئے کس طرح اسکول قائم کیے جائیں اور یہ کہ اسکول میں بچوں کو مار کر نہ پڑھایا جائے۔

ان مسائل کے حل کیلئے غور و فکر کی اشد ضرورت ہے کہ کیا والدین ہی کی ذمہ داری ہے کہ اولاد کی نشوونما اور نگہداشت کریں، ان کے خورد و نوش، تعلیم اور صحت کا بندوبست کریں۔ اگر کسی باپ کے تین بچے ہیں، اس کا ذریعہ معاش محدود ہے۔ اسے صرف اتنی مزدوری ملتی ہے کہ ہوٹل پر کھا کر بمشکل گذارا کرتا ہے، جب گھر آتا ہے تو بچوں کو مارے بھوک کے نڈھال پاتا ہے ایسے مجبور باپ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، کیا آپ کی رائے کے مطابق اس پر واقعی لازم ہے کہ ان کی غذا اور زندگی کے دیگر لوازمات کا انتظام کرے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ مہذب سماج میں یہ اصول مسلم ہے کہ حیوانوں کے ساتھ بھی ظالمانہ سلوک نہ کیا جائے۔ اگر کسی کے پاس گدھا ہے اور وہ اسے بے رحمی کے ساتھ مارتا ہے تو ان ممالک میں ایسے شخص کو عدالت میں طلب کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مہذب سوسائٹیوں کا یہ معمول ہے کہ اگر باپ اپنے بچوں کی نگہداشت اور نشوونما کی ذمہ داری پوری نہ کرے تو اسے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ کیونکہ جب وہ ان کے نان و نفقہ اور نشوونما کی ذمہ داری نہیں سنبھالتا تو اس دنیا میں کس وجہ سے آیا ہے؟

ببین آں بے حمیت را کہ ہرگز
نہ خواهد دید روئے نیک بختی

تن آسانی گزینہ خویشتی
زن فرزند بگذارد بسختی

ترجمہ: یعنی اس بے حمیت اور پست ہمت کو دیکھو، وہ کبھی سعادتمندی اور نیک بختی کا منہ نہ دیکھے۔ کیونکہ وہ اتنا تن آسان ہے کہ اپنی بیوی بچوں پر بھی سختی کرتا ہے۔

اس لئے کہ آدمی اگر شادی بیاہ کرتا ہے اور اس کے بیوی بچے بھی ہیں تو ان کے کھانے پینے کا اہتمام اس کی فطری ذمہ داری ہے۔ یہ اس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اہل خانہ کے نان و نفقہ کا معقول بندوبست کرے اور زندگی کے دوسرے لوازمات بھی پورے کرے۔

اب ذرا اس سے آگے سوچئے، جس موضوع کو میں نے گذشتہ پندرہ ماہ میں متعدد بار دھرایا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کے لئے جسمانی غذا اتنی اہم نہیں جتنی ذہنی غذا لازمی ہے۔ ذہن کا اپنا وجود ہے۔ جسم کو اچھی غذا دینے سے آپ اچھے حیوان بن سکتے ہیں جبکہ ذہن کو اچھی غذا دینے سے اچھے انسان بن سکتے ہیں، اس لئے انسانی ذہن اور روح کے لئے بھی خوراک کا اہتمام کرنا ناگزیر ہے۔ اسے علم و ادب اور غور و فکر کی غذا کہہ سکتے ہیں۔

ایک زمانہ میں والدین بچوں کی جسمانی نشوونما کو نسبتاً کم اور ذہنی نشوونما اور ارتقاء کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور مقصود یہ ہوتا تھا کہ اس طرح ایک اچھا انسان تیار ہوسکے۔ کیونکہ ایک اچھا انسان اچھی عادات کی وجہ سے انسانیت کے بلند مراتب تک رسائی حاصل کرلیتا ہے۔ اس لئے بچے کی جسمانی نگہداشت کے ساتھ ساتھ اسے تعلیم دینا بھی اس کی اولین ذمہ داری ہے، اسے ہم لازمی تعلیم کہتے ہیں۔ بچہ جب بڑا ہونے لگتا ہے تو اسے بتایا جاتا ہے کہ: طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم و مسلمة (الحدیث) یعنی ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم کی تحصیل فرض عین ہے۔

Marfat.com

یوں اسے ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ دین اسلام کی تعلیم کا حصول اس پر لازم ہے۔ لازمی ہونے کا مطلب اس ذمہ داری کا احساس اور آگہی پیدا کرنا ہے جو انسان بننے کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے کوئی فرد یا سوسائٹی جب یہ محسوس کرے کہ حصولِ علم فرضِ عین اور اولین ذمہ داری ہے تو اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے بچوں کے باپ کو مجبور کیا جائے گا کہ اپنی اولاد کی جسمانی خوراک کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی نشوونما کا بھی معقول انتظام کرے۔ جیساکہ میں نے ابھی بتایا، ذہنی خوراک درحقیقت جسمانی خوراک سے زیادہ اہم اور مقدم ہے۔ اگرچہ موجودہ دور میں اس نظریے کو پرانی بات سمجھ کر درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا اور اسی کا نتیجہ ہے، جیساکہ پروفیسر خان نے آپ کو بتایا کہ اس وقت بہترین اسکول، بڑے بڑے کالیجز، معیاری کتابیں، ماہر اساتذہ، قابل پروفیسر صاحبان، مستند لیکچرار کافی تعداد میں موجود ہیں، لیکن کوئی فطری طریقہ پر اپنی ذمہ داری نہیں نبھاتا، جس طرح کسان فطری طریقے پر اپنے بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ وہ ان کو دودھ اور کھانا بھی دیتا ہے اور ان کی نشوونما کی نگہداشت بھی کرتا رہتا ہے۔ قطع نظر اس امر سے کہ وہ اپنی اولاد کو باجرے کی روٹی کھلاتا ہے یا بکری کا دودھ پلاتا ہے بہرحال یہ بات طے شدہ ہے کہ اگر استاد نہیں ملتا تو کم از کم اسے لکھنے پڑھنے اور حساب سکھانے والا استاد تو مل ہی جائے گا۔

بحث سے معلوم ہوا کہ انسان کے لئے ذہنی غذا بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی جسمانی غذا ، یہاں تک کہ دونوں، ایک دوسرے سے زیادہ اہم ہیں۔ کیونکہ اچھے سے اچھا حیوان بھی ایک انسان سے بہت کم درجہ اور حیثیت کا حامل ہے۔ اگر کوئی شخص اچھا حیوان ہے تو وہ خطرناک انسان ہے، اس لئے اسے کمزور حیوان اور اچھا انسان ہونا چاہئے اور ذہنی خوراک سے ہی وہ اچھا انسان بنتا ہے اور یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ اولاد کی دونوں ضرورتوں کا اہتمام کرے۔

ماضی میں یہ مسئلہ آسان تھا کیونکہ تعلیم کو بچہ کے لئے لازمی غذا سمجھا جاتا

Marfat.com

اور اس کا اہتمام آسان بھی تھا۔ تعلیم کیا ہے؟ کس طرح کی تعلیم دی جائے؟ بچے کی تعلیم و تربیت کا مطلب کیا ہے؟ اس کے لئے کونسی تعلیم اچھی ہے اور کونسی زہر قاتل؟ پہلے اس بارے میں لوگوں کے نظریات واضح تھے اور ان سوالات کی روشنی میں وہ بچے کے مستقبل کا آسانی کے ساتھ تعین کرتے تھے، لیکن موجودہ دور میں یہ ایک گھمبیر مسئلہ بنادیا گیا ہے۔

میری اہلیہ نے یہ مراسلہ عجلت میں بھیجا، تاکہ ہمارے یہاں جو سائنسی کانفرنس ہورہی ہے اس میں شریک خواتین و حضرات کو بتایا جائے کہ دور حاضر کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ جب ہمارے ملک میں کوئی سائنسدان آتا ہے تو وہ ہمیں یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ اسے ایک "سائنسی مذہب" کی تلاش ہے۔ وہ (مسز ایلسا قاضی) کہتی ہیں کہ سائنسدانوں کی یہ بات ہی غلط ہے۔ سامعین حضرات! میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس کی تہہ میں ابھی نہیں پہنچے۔ "سائنسی مذہب" کی بات کرنے کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ پوری انسانی تاریخ کو الٹ پلٹ کرنا چاہتا ہے۔ کیا یہ کوئی اچھی بات ہے؟ وہ ہمیں "حیاتیاتی مذہب" دینا چاہتے ہیں یعنی وہ ہم میں سے ہر ایک کو اچھا حیوان بنانا چاہتے ہیں، جسے وہ "سائنسی مذہب" کہتے ہیں۔ اور جیساکہ ہم اوپر تفصیل سے بتا کر آئے کہ خرابی کی اصل جڑ یہی ہے۔ کیونکہ انسان کی بنیادی ضرورت صرف حیاتیاتی یعنی جسمانی غذا نہیں بلکہ ذہنی غذا بھی اتنی ہی اہم ہے، جو اسے اچھا انسان بناسکتی ہے۔ یہ سائنسدان حضرات صرف حیاتیات پر زور کیوں دیتے ہیں؟ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے تیرہ سو سال کی تاریخ فراموش کردی ہے۔ یا انہوں نے تاریخ نہیں پڑھی اور اگر پڑھی ہے تو غلط پڑھی ہے۔

مجھے جیولن ہکسلے کے بارے میں یہ الفاظ انتہائی افسوس کے ساتھ کہنے پڑتے ہیں کہ شاید انہوں نے تاریخ نہیں پڑھی اور اگر پڑھی ہے تو غلط پڑھی ہے۔ اگرچہ آلڈس ہکسلے کے مقابلہ میں جیولن ہکسلے کی میرے دل میں زیادہ

Marfat.com

عزت و احترام ہے۔ کیونکہ وہ بڑا سائنسدان ہے۔ اگر یہ عظیم سائنسدان تاریخ کو صحیح تناظر میں پڑھتا تو اسے معلوم ہوجاتا کہ حیاتیات اسلام کے بغیر ممکن نہیں، کیونکہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے ہمیں بایالوجی (حیاتیات) کا صحیح تصور دیا ہے۔ میں ابھی تک اس آیت کریمہ میں مضمر حقیقتوں کا ادراک نہ کرسکا، جو ہمیں آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن کے ذریعے معلوم ہوئی تھی کہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیَاتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ، الآیہ. کیا آپ کو مذہب کا احساس ہے، آپ کو مذہب کے بارے میں معلومات نہیں کہ وہ ہماری کس طرف رہنمائی کرتا ہے؟ یہ رہنمائی دو طریقوں سے حاصل کی جاسکتی ہے: اولاً تخلیق کائنات کے سلسلے میں زمین اور آسمان کو اپنی تحقیق کی جولانگاہ بناکر۔ ثانیاً انسانی زندگی پر غور و فکر کر کے اس سے نشانیاں نظر آجائیں گی جو صحیح سمت میں سفر حیات طے کرنے میں مدو معاون ہوں گی۔ یہ تعلیم ہمیں چودہ صدیاں پہلے دی گئی تھی۔ اس فرمان خداوندی کی تعمیل کرتے ہوئے مسٹر ہکسلے نے کائنات اور انسانی نفسیات کے مطالعے کی طرف توجہ دی، حالانکہ وہ اپنے ملک کی تاریخ سے بھی واقف نہیں۔ لیکن مسٹر ہکسلے کہتا ہے کہ چونکہ قرآن پہلا حکم یہ دیتا ہے کہ وفی الافاق یعنی پہلے آفاق و کائنات میں تلاش کرو اور پھر فرماتا ہے کہ "وفی انفسھم" انسانی پیدائش میں غور کرو۔ اس وجہ سے پہلے کائنات، چاند ستاروں اور سیاروں، حیوانات و نباتات کے بارے میں تحقیقات کرنی چاہیئے اور اس کے بعد تخلیق انسانی کے مضمرات پر غور و فکر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ عقلمندوں اور سائنسدانوں کا کام ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ میں آیات لاولی الالباب، اس میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ یہی وہ مذہب ہے جس نے انسان کو پڑھنے لکھنے کی طرف مائل کیا۔ آج ہم اسی معلومات کو سائنسی علوم کہتے ہیں۔ لیکن افسوس! صد افسوس!! مسلمانوں نے جو علمی کام شروع کیا تھا، اسے انہوں نے یکسر بھلادیا ہے۔

مسٹر کومیٹ کیا تھے اور کیوں آئے اور انہوں نے سائنسی طریقہ کی ابتدا کہاں سے کی؟ کیونکہ انسان مٹی کی تخلیق ہے۔ پھر وہ حیاتیات کی طرف کیوں آیا؟ حیاتیات کے وجود کی حقیقت کے بعد وہ حقیقت کی طرف آجاتا ہے۔ کائنات کی تخلیق میں حیاتیاتی علم گول دائرے کی صرف ایک کمان ہے، یہ مکمل احاطہ نہیں کرتی۔ ایک چھوٹی سی کمان آپ کو مکمل گول دائرے کا تصور نہیں دے سکتی۔ زندگی اس سے بہت آگے ہے۔ اس زندگی سے آگے ایک اور زندگی ہے، جس میں موجودہ زندگی کا علم نہیں اور اس کے بارے میں ہم یہاں اکثر گفتگو کرچکے ہیں۔ اس لئے "حیاتیاتی مذہب" ہمیں کیا بتائے گا؟ زیادہ سے زیادہ چند چیزیں بتائے گا، جس کے بارے میں ہمیں کہا جاتا ہے کہ اس میں غور وفکر کرنی چاہئے۔ اور بقول مسز ایلسا جو بھی سائنسدان آتا ہے وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کو "سائنسی مذہب" دیا جائے، حالانکہ وہ خود سائنسی حقائق سے آگاہ نہیں ہیں، کیونکہ سائنس اس مذہب کی ایجاد ہے جن کے پیروکاروں کے بارے میں یہ سائنسدان حضرات کہتے ہیں کہ ہم ان کو سکھانے آئے ہیں، حالانکہ اس دین اسلام نے ہی سب کچھ سکھایا ہے کہ کائنات اور اس میں موجود اشیاء اور ان کی زندگی کے بارے میں غور وفکر کیا جائے کہ یہ انسان اور کائنات کس عظیم مقصد کے لئے وجود میں آئی ہے اور یہ کہ اس میں جو نشانیاں ہیں وہ کس منزل کی طرف ہماری رہنمائی کررہی ہیں؟

اب آپ نے دیکھا کہ فرق کہاں ہے؟ اس کے باوجود ایک سائنسدان دوسرے کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ ایک دوسرے کو آمنے سامنے برا بھلا کہتے ہیں، کیونکہ ایک کہتا ہے کہ موروثی خصلتیں ورثہ میں ملتی ہیں اور دوسرا کہتا ہے کہ ایسا نہیں اب آیئے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔

Marfat.com

اسی مجلس میں کچھ دیر پہلے ایمان کے بارے میں یہ گفتگو ہوئی تھی کہ جب ہم کہتے ہیں کہ یہ ہمارا اعتقاد ہے یعنی یہی ہمارا ایمان بھی ہے، گویا ایمان بھی ایک طرح کا عقیدہ ہی ہے جو دوسرے پر بھروسہ کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں اکثر لوگ ہیں جو قدرت کے موروثی قانوں سے ناواقف ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ قانون کس طرح نسل در نسل باپ سے اولاد میں منتقل ہوتا اور نسل انسانی میں تبدیلی اور اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ پس سوچنا یہ ہے کہ کیا ایک نسل کے فرد کی عادات و اطوار اس کی اولاد میں بطور ورثہ لازماً منتقل ہوتی ہیں؟ میں پوچھتا ہوں کہ ہم میں سے کتنے حضرات ہیں، جنہوں نے ان حیاتیاتی حقائق کا تجربہ کیا ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ کسی نے بھی نہیں کیا۔ یہی حال حیاتیات کے دو ماہرین کا ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو مطمئن نہیں کر سکتا، اگرچہ دونوں اس بارے میں خاص واقفیت اور معلومات بھی رکھتے ہیں۔

ہم نے صرف شرفاء پر یقین کیا ہے۔ ظاہر ہے جس شخص کا رجحان مثلاً ھکسلے کی طرف ہے تو وہ کہے گا کہ ھکسلے صحیح ہے، کیونکہ وہ اسے پسند کرتا ہے۔ دوسرا شخص کہے گا کہ نزہدین صحیح ہے، کیونکہ وہ کمیونسٹ ہے اور روس کو پسند کرتا ہے۔ کمیونسٹ کہتا ہے کہ انگریز قدامت پسند ہیں، روسی انگریزوں سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ اسی طرح آپ کو بھی اپنے ایمان ویقین کے مطابق فیصلہ کرنے اور نظریات اپنانے کا حق حاصل ہے۔ مثلاً جیولین ھکسلے ایک بات کہتا ہے اور نزھدین دوسری بات اور آپ کو اس بات یا اس نظریے کے بارے میں علم بھی نہیں ہوتا تو لازماً آپ ان میں سے کسی پر اعتماد کرتے ہوئے کوئی نظریہ اختیار کرتے ہیں۔ زندگی کے دوسرے معاملات اور مسائل میں بھی ہمیں کسی نہ کسی شخص پر لامحالہ طور پر یقین کرنا پڑتا ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ فلکیات کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے

Marfat.com

چالیس ہزار سال مطالعہ اور محنت کی ضرورت ہے، کیا ایک شخص کے لئے ایسا کرنا ممکن ہے؟ چالیس ہزار سال گذر جانے کے بعد ایک ستارے کی حرکت کو صحیح پیمانے پر ناپا گیا۔ آئندہ جو شخص بھی فلکیات کا مطالعہ اور تحقیق کرے گا، لازمی بات ہے کہ اسے اپنے پیش رو ماہرین فلکیات کی معلومات اور نظریات پر یقین کرنا پڑے گا اور اس بارے میں اپنے سائنسی تجربات اور نظریات ایک دوسرے کی طرف منتقل کرنے پڑیں گے۔ اگرچہ ان نظریات میں کمی بیشی اور تحقیق و تدقیق کا دروازہ مسلسل کھلا رہتا ہے۔ مثلاً پہلے یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ ایک دمدار ستارہ سترھویں صدی میں ظاہر ہوا جو انیسویں صدی میں سورج کے گرد گردش کرے گا۔ اب انیسویں صدی گذر جانے کے بعد کوئی سائنسدان پیدا ہوتا ہے، جو کہتا ہے کہ، دمدار ستارہ انیسویں صدی میں گذر چکا۔ یوں یکے بعد دیگرے سائنسدان سائنسی میدان میں ایمان و یقین دوسروں کی طرف منتقل کرتے رہتے ہیں۔ زندگی کے دیگر عقائد کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اس اہم نکتہ پر آپ غور کریں، میں آپ کو تعلیم کا صحیح معیار بتاتا ہوں۔

دنیا میں اس وقت تک جو بہترین افراد پیدا ہوئے ہیں، وہ اس کثافت یا ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتے چلے آئے کہ وہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں؛ نیز وہ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں۔ اگر ایک شخص کسی ملک کا بڑا سائنسدان ہے تو دوسرا کسی دوسرے ملک کا، لیکن دونوں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ بقول ھکسلے سائنسدان؛ سائنس اس لئے پڑھاتا ہے کہ اس کے نظریات کا تتبع کیا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ جرم ہے؟ ظاہر ہے یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ میں نے بھی قرآنی نظریات کا تتبع کیا اور سائنس حاصل کی ہے۔ اس میں میں نے کیا قصور کیا؟ میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ پر ایمان لاتا ہوں، جن میں حقانیت وصداقت کا جوہر موجود ہے اور آپ

Marfat.com

ﷺ کو رہنما بنا کر ہی میں علمی سفر میں آگے بڑھا۔ میں نے اس اشارے پر یہ علم حاصل کیا جو تیرہ صدیوں کے بعد بایالاجی یعنی حیاتیات نے ثابت کیا۔ درحقیقت مجھے کہا گیا کہ اگر آپ سائنس کو اس معیار پر پڑھیں گے، تو آپ کو یقین کی دولت حاصل ہوگی اور آپ اپنی آنکھوں سے وہ کچھ دیکھ سکیں گے، جو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے' چنانچہ اس طریقے پر جو مشاہدات ہم نے کیئے اس کے ذریعے شاندار نتائج اور مثبت فوائد حاصل ہوئے۔ مسٹر ہکسلے کہتے ہیں کہ ہم نے قرآن مجید کے ذریعے جو مشاہدات کیے ہیں، وہ کافی ہیں' جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس مادی دنیا میں کوئی طاقت ایسی موجود ہے جو ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم اس طاقت کو دیکھ بھی لیں۔ بات صرف یہ ہے کہ ہم نے اس طاقت کی رہنمائی میں بے شمار اشیاء کا علم حاصل کیا ہے اور جن چیزوں کو ہم نہیں جانتے' قرآن کے الفاظ میں ومما لا یعلمون تو ان کا علم حاصل کرنا ہے اور اس کو ہم سائنس کہتے ہیں' جس کے حصول کے لئے ہمیں چودہ صدیاں پہلے حکم دیا گیا تھا۔ قرآن مجید کے اس حکم پر موجودہ دور کے انسان نے جب عمل کیا تو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کیسے زبردست انکشافات ہوئے اور فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ یعنی جو چیزیں آپ دیکھ رہے ہیں، اس میں بے شمار نشانیاں ہیں، جو انسان کی اللہ تعالیٰ کے وجود کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ لیکن کیا اس کے بعد بھی آپ مشاہدات نہیں کریں گے؟ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (ترجمہ) کیا تم نہیں دیکھتے؟ مشاہدہ نہیں کرتے؟ چنانچہ جن لوگوں نے مشاہدات اور تجربات کیے، انہوں نے شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ اسی کو ہم "سائنس" کہتے ہیں۔

اب جو سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ سائنس گویا اچانک ان پر آسمان سے نازل ہوئی ہے تو مہربان حضرات! ایسا نہیں ہے۔ یہ علمی کمال تو ایک معمولی مظہر اور

Marfat.com

ادنیٰ پرتو ہے اس قرآن مجید کی تعلیم کا، جس میں ایسے اور بہت سے کمالات اور خزانے بھرے پڑے ہیں۔ ابھی تو صرف چند غیر معلوم حقائق معلوم ہوئے ہیں اور بہت سارے حقائق کا ادراک کیا جانا ہے۔ جب انسان انہیں دریافت کریگا تو اسے بھی "سائنس" ہی کہا جائے گا۔ کیونکہ "سائنس" کے معنیٰ ہیں علم حاصل کرنا۔

الحاصل مذہب آپ کو سائنس دیتا ہے اور سائنس آپ کو مذہب دیتی ہے۔ لیکن آپ اس بات کو الٹ پلٹ کر دیتے ہیں۔ مذہب کائنات اور زندگی کے معاملات میں طرز فکر و طرز عمل و حکمت کا نام ہے، جو ابھی تک انسان نے حاصل نہیں کی، مگر الحمد للہ! ہم نے اسے پہلے ہی بطور ایمان کے قبول کرلیا ہے۔ ہم اس تسلسل کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور نت نئے حقائق دیکھ کر مطمئن ہوتے ہیں اور خود بخود اس یقین و اذعان میں اضافہ ہوجاتا ہے کہ مذہب نے جس طرف ہماری رہنمائی کی ہے، وہ بالکل حق و صداقت ہے، نیز یہ بھی عین حقیقت ہے کہ اسی بالااتھارٹی (Authority) کی تعلیم کی تعمیل و تتبع کی بنا پر ہی ان حقائق تک ہماری رسائی ممکن ہوئی ہے۔

(ہمارے رجسٹرار) محمد حسین صاحب کہتے ہیں کہ جو بھی تعلیمی اشیاء ہیں، سب کو "اسلامی" بنانا پڑے گا۔ مجھے نہیں معلوم، اس سے اس کا کیا مطلب ہے؟ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تعلیم کا ایک معیار ہے۔ تعلیم کا مطلب صرف لکھنا پڑھنا اور حساب سیکھنا نہیں، جیساکہ ہمارے پروفیسر صاحب نے کہا، بلکہ تعلیم میں بہت کچھ آتا ہے۔ تعلیم ایسی ہو، جس میں جبر نہ ہو، جیساکہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ لا اکراہ فی الدین (ترجمہ) دین میں کوئی زور زبردستی نہیں۔ سیکھنے والا اپنی خوشی اور شوق سے سیکھے۔ آپ کو قدرت نے آنکھیں دی ہیں، ان سے دیکھیں اور سیکھنے کی کوشش کریں، خود دیکھ کر مطمئن ہوں، آپ

Marfat.com

اس فرمان باری تعالیٰ پر عمل پیرا ہوں جو قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ (ترجمہ) کیا تم غور وفکر سے کام نہیں لیتے؟ اور تجربہ و مشاہدہ نہیں کرتے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مذہب آزاد سوچ میں کاوٹ پیدا کرنا چاہتا ہے میں ایسے لوگوں سے کہتا ہوں کہ ارے بیوقوف! مذہب تو ہمیں کہتا ہے کہ سوچ بیچار سے کام لو۔ آزادی کے ساتھ سوچو۔ "آزاد سوچ" اور "پابند سوچ" کا مطلب کیا ہے؟ آپ بتائیں کہ وہ آپ کو سچ سے کس طرح روکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کو پیدا ہی آزادیٔ عمل اور حریت فکر کے لئے کیا ہے۔ اور قرآن مجید آپ سے بار بار یہ سوال کرتا ہے کہ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ - اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ - اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ - اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا (ترجمہ) کیا آپ دیکھ نہیں رہے۔ کیا غور فکر نہیں کر رہے؟ کیا عقل سے کام نہیں لیتے؟ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟ کیا وہ صم بکم عمی بنے ہوئے ہیں۔ ان آیات سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ مشاہدہ اور غور فکر سے کام لیں۔ مشاہدہ اور غور فکر نے سائنسی علوم کی متعدد شاخوں کو جنم دیا ہے، لیکن یہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ صرف ایک دائرے کی چھوٹی سی کمان معلوم ہوتی ہے، اور مکمل دائرے کی حقیقت ابھی معلوم کرنی ہے۔ ہمارے لیے ابھی دونوں اطراف تاریک ہیں۔

ہمیں ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے، جو اپنی قوتوں کو پہچانیں اور انسانی نسل کی تعلیم و تربیت کر سکیں، اور انہیں ذہنی غذا دے سکیں اور ایسی غذا بہم نہ پہنچائیں جو ان کے لئے مضر و مہلک ہو۔ اچھی غذا اور خراب غذا کیا ہے؟ اگر آپ طب اور منطق کی کتابیں پڑھیں گے تو آپ کو اشیاء کے خواص کا علم ہو جائے گا کہ کس چیز میں کیا تاثیر و خاصیت ہے۔ مثلاً انڈا زیادہ گرم کیا جائے گا تو دیر سے ہضم ہو گا اور معمولی گرم کیا جائے گا تو جلد ہضم ہو گا۔ چقندر زیادہ گرم کیا

جائے گا تو ھضم نہ ہوگا۔ اچھی سے اچھی گندم کی روٹی بھی جل جائے تو پیٹ میں درد کرے گی۔ ان تمام چیزوں کی ماہیت آپ کو سیکھنے سے معلوم ہوگی۔ اسی طرح ذہن کو توانا رکھنے کے لئے بھی صحیح غذا اور خوراک کی ضرورت لاحق ہے۔ میں نے گذشتہ دنوں تقریر میں کہا تھا کہ: انسانی صحت اور تندرستی کا تعلق جسم اور ذھن دونوں سے ہے، دونوں کے لئے قانون ایک ہی ہے۔ اب یہ باپ کا فرض ہے کہ وہ اولاد کی جسمانی اور ذہنی نشوونما کا اہتمام کرے۔ اگر وہ ان کی ذہنی نشوونما میں مطلوب غذا کا بندوبست نہیں کرتا تو وہ بالکل وہی گناہ کرتا ہے، جو جسمانی خوراک بہم نہ پہنچا کر کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ خاندان کے بزرگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ کی تمام ضروریات کا انتظام کرے، جب ہم میں سے ہر شخص اپنا یہ فرض ادا کرے گا تو ایسا کرنے سے ملکی مسائل حل ہوسکتے ہیں اور یوں ہم اس فرض کی ادائیگی کے بعد تعلیم کے لئے یورپی اور امریکی تعلیمی اداروں کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے نہیں دیکھیں گے۔

مثال کے طور پر جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اگر وزیر صحت کو معمولی بھی احساس اور شعور ہوگا تو صحت اور تندرستی کے اصولوں کو عام کرنے کے لئے ریڈیو، ٹی وی اور دیگر نشریاتی اداروں کی خدمات حاصل کی جائیں گی، صحت کے جامع اصول شایع کر کے گھر گھر پہنچانے کا اہتمام کیا جائے گا اور لوگوں کو یہ تربیت دی جائے گی کہ تندرستی اور صفائی کے یہ اصول ہیں، بچے کی تعلیم اور پرورش اس طرح کی جائے، کھانے پکانے کے طریقے یہ ہیں۔ اس طرح بچے کے والدین اور سرپرستوں کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ کس قسم کی تعلیم ضروری ہے، تاکہ اس کے لئے اچھی کتابیں فراہم کی جائیں اور بہتر معیار مقرر کیا جائے۔ جن علاقوں میں معیاری تعلیمی ادارے نہ ہوں اور فنڈز کی بھی کمی ہو، وہاں لوگوں کے اندر یہ احساس اجاگر کیا جائے کہ جسمانی غذا کے ساتھ ساتھ تعلیم کو فروغ دینا بھی آپ کا

Marfat.com

فرض ہے اور اس سلسلے میں آپ اپنی ذمہ داری ادا کریں۔

میں نے متعدد بار یہ بات کہی ہے کہ قرآن مجید اس دور میں نازل ہوا، جو جسمانی غذا کا نہیں، ذہنی غذا اور ترقی کا دور تھا۔ چنانچہ سب سے پہلی وحی اقرأ نازل ہوئی، یعنی پڑھ، اس خوراک کے اہتمام کا حکم کیونکر ہوا؟ چونکہ تعلیم زندگی کے لئے انتہائی بنیادی اہمیت کی حامل ہے، اور جسمانی غذا کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں ہے۔ قرآن مجید سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ: ولباس التقویٰ ذالک خیر یعنی ہم نے انسان کو جسمانی خوبصورتی کے لئے جسمانی لباس پہلے ہی عطا کیا ہے، اب اسے تقویٰ کے لباس کی ضرورت ہے، تقویٰ کا یہ لباس کیا ہے؟ یہ انسانی نفس کی تہذیب' اس پر ضبط اور ضابطہ کا لباس ہے۔

یوں مذہب "اسلامی" صورت اختیار کرتا ہے۔ "اسلامی" کا مطلب ہے قرآن مجید کو صحیح طریقے سے سمجھنا۔ اس کے بغیر مذہب اسلامی بن ہی نہیں سکتا۔ اگر قرآن نہ سمجھا گیا تو کسی چیز کو سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ اگر کوئی شخص "الکتاب" نہیں سکھا سکتا تو، دوسرے سارے علوم فضول ہیں۔ لوگوں نے ابھی تک قرآن مجید کو نہیں سمجھا۔ اگرچہ چند ایک حضرات ایسے بھی ہیں جو "الکتاب" کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں اسی کو اسلامائیزیشن (Islamization) کہتا ہوں، جب یہ مرحلہ پورا ہو جائے گا تو آپ دیکھیں گے کہ ہر'چیز آسان ہو گئی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے متعدد بار کہا ہے کہ ابن آدم ابھی تک تاریکیوں میں ہے۔ ہم اور آپ دنیا کے کسی نہ کسی قاعدے اور قانون کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ لوگ ابھی تک صرف "میں اور تو" کے چکر میں مبتلا ہیں، اس سے آگے بڑھ کر انہیں زندگی کی حقیقت کا شعور اور آگہی حاصل نہیں۔ نیز صداقت مادی مفادات سے بالاتر ہو کر، وہ کسی چیز کو سننے کے لئے تیار نہیں۔ کوئی سنجیدہ بات کو سننے کے لئے تیار نہیں، جیولن اور نرنہدین دونوں ایک

دوسرے کو سننے سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔

میرے مہربانو! ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور سمجھنے کی کوشش کریں، خود غرضی اور قومیت کے لئے نہ لڑیں، جب انسان خود پرستی کے خول سے نکل کر سچ کے لئے آمادہ ہوتا ہے تو اس کے بعد ہی سیکھنا ممکن ہے۔ مسٹر خان صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ پاکستان میں تعلیم کے لئے 600 کروڑ روپے کی ضرورت ہے، میں عرض کرتا ہوں کہ پاکستان میں کم رقوم سے بھی تعلیم کو عام کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ والدین اپنا فرض ادا کریں۔ کیونکہ اولین درسگاہ اور تعلیم و تربیت کا مبدا و مرکز والدین اور بالخصوص ماں ہوتی ہے۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: **الجنة تحت اقدام الامهات** (ترجمہ) جنت ماں کے پاؤں تلے ہے۔ یہ اسی کے ہاتھ میں ہے کہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دے۔ اگر ماں اپنے بچے کو نہیں سکھاتی تو پھر اسے کوئی نہیں سکھاسکتا، اگر ماں حیوان ہے تو وہ اپنے وجود سے حیوان ہی کی نشو ونما کا ذریعہ بنیگی، اگر وہ انسان ہے تو فرشتے پیدا کرے گی۔ اس لئے عورتوں کو پڑھایا جائے۔ **طلب العلم فريضة علىٰ كل مسلم و مسلمة** علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ ہم ابھی اس درجے پر نہیں پہنچے۔ ہم اب تک یہ معلوم کررہے ہیں کہ عورت کو کیا پڑھایا جائے اور کیا نہ پڑھایا جائے۔ تیرہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی یہ تصور گردش کررہا ہے کہ آپ وصفی، مقداری اور دیگر تعلیم کے اصناف پر بات کررہے ہیں۔ لیکن یہ اس وقت ہوگا جب آپ سنجیدہ ہوں گے، جب آپ خود روشنی سے منور ہوں گے، تو اللہ کی دھرتی کو منور کرسکیں گے۔ **يخرجهم من الظلمات الى النور** (ترجمہ) اللہ ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکالتا ہے۔ **صبغة الله** (ترجمہ) اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ یعنی اپنے اندر وہ روشنی پیدا کریں، اس کے بعد جب آپ

Marfat.com

تبلیغ کریں گے تو پھر دیکھیں گے کہ یہ بڑے سائنسدان کس طرح آپ کو چھوٹے اور ہلکے نظر آرہے ہیں، لیکن یہ اس وقت ہوگا جب آپ کو کتاب اللہ کا شعور اور ادراک حاصل ہوگا اور میں شرطیہ کہتا ہوں کہ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ "الکتاب" کیا ہے۔ لائبریریاں بھری ہوئی ہیں، لیکن "الکتاب" کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ آپ ہکسلے یا نزہدین کے بیانات پر یقین کرتے ہیں، حالانکہ آپ نے ان کے تجربات نہیں دیکھے، مگر "الکتاب" کی تعلیمات پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے میرے مہربان دوستو! مجھ جیسے فرد کے کہنے پر ایمان لائیں کہ یہ "الکتاب" اپنے اندر وہ سب کچھ رکھتا ہے، جو ممکن حد تک تم جان سکتے ہو یا جس کے جاننے کی آپ کو ضرورت ہے۔ آپ وہ حاصل کریں جو تیرہ صدیوں سے براہ راست یا بالواسطہ طور پر معلوم کیا گیا ہے۔ یہ اس "الکتاب" کی بدولت ہے۔ کوئی بھی تاریخ نویس خواہ یورپ میں ہو، یا امریکہ میں، چین میں ہو یا انڈیا میں، اس بات کا انکار نہیں کرسکتا۔ میں نے اتنی تاریخ پڑھی ہے، کہ بہت کم لوگوں نے اتنی پڑھی ہوگی۔ اس لئے آپ میری بات پر ایمان لائیں اور اس پر عمل کریں، جس طرح آپ دوسرے سائنسدانوں کے کہنے پر یقین کرتے ہیں۔ میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں، اور نہ بڑھا چڑھا کر بات کرتا ہوں اور قرآن مجید کے بارے میں مبالغہ کرتا ہوں، بس آپ اس پر ایمان لائیں۔

Marfat.com

# مسلمان سائنسدانوں کی ایجادات

خواتین وحضرات! میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اس وقت علمی اور معلوماتی تقریر سنی۔ آپ نے پہلے کبھی ایسی تقریر نہیں سنی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری اس رائے سے کافی لوگ اتفاق نہ کریں گے۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو وہ بددیانت اور غیر منصف ہے۔ آپ نے کبھی چالیس منٹ میں مسلمانوں کی ایجادات کی اتنی طویل فہرست نہیں سنی ہوگی، جو آپ نے ابھی سنی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سلسلے میں مزید وضاحت ضروری ہے۔ کئی صدیوں سے جان بوجھ کر جھوٹی تاریخ بیان کی جارہی ہے، جس کو نمایاں کرنا ہے۔ یہاں کچھ اچھے اہل علم حضرات ہیں جو دنیا کو بتائیں گے کہ یورپ کتنا احسان فراموش ہے، کہ اس نے جو کچھ عرب مسلمانوں سے حاصل کیا ہے، اس کی نفی کرتا ہے۔ بہرحال یہ تو ضمنی سوال ہے۔

کل مجھے دی السٹریٹیڈ نیوز (The Illustratedl news) پڑھتے ہوئے ایک خاص بات نظر آئی۔ ایڈیٹر صاحب نے اپنے مراسلہ میں بہت دلچسپ الفاظ لکھے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ کافی وقت سے یہ سمجھا گیا ہے کہ جھوٹ کو بار بار دھرانے سے وہ سچ کی صورت اختیار کرلیتا ہے، صرف تسلسل کے ساتھ جھوٹ کو دہرانے کی ضرورت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لیکن ہمیں لارڈ ایکٹن (Lord Acton) کے یہ الفاظ بھی یاد رکھنے چاہئیں، جو کہتا ہے کہ یہ بات مکمل طور پر صحیح بھی نہیں، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ آخری کامیابی سچ کی ہی ہوتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ سچ کو چھپایا نہ جائے۔ اگر سچ کے ساتھ لوگوں کی دلچسپی نہ ہو تو اس صورت میں سچ قائم نہیں ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ مسلسل جھوٹ بولنے سے وہ سچ

Marfat.com

بھی ہوجاتا ہے، لیکن کوئی شخص اس کے بارے میں پوچھتا ہی کب ہے کہ وہ سچ ہے یا جھوٹ؟ وہ کہتا ہے جھوٹ کو دو تین بار سننے یا کسی اخبار میں پڑھنے سے لوگوں کی اکثریت اسے سچ سمجھنے لگتی ہے۔ لیکن اگر ہر شخص یہ ارادہ کرے کہ اب مجھے جھوٹ نہیں بولنا تو سچ قائم ہوگا۔

یہاں میں کیمسٹری کے بارے میں ایک چھوٹا سا نکتہ بتاؤں گا، جیساکہ ہمارے بھائی نے دوران تقریر بیان کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بین زائن (Ben Zoin) تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا، جو جدید دور میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ لوبان جاوانی کی بگڑی شکل ہے۔ کسی کو پتہ نہیں کہ لوبان سے بین اور جاوانی سے زائن کس طرح بن گیا، اس لئے جب بین زائن کا لفظ آتا ہے تو ہم الجھ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ عربوں کی ایجاد نہیں، یہ کوئی جدید سائنسی فارمولا ہے۔

ایک بار ایک انگریز دوست کے ساتھ میری گفتگو ہوئی، ہم عربی کے ان الفاظ کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے، جن کی انگریزی میں بدلی ہوئی صورتیں استعمال ہوتی ہیں۔ میں نے کہا کہ مہربانِ من! یہ بات یقینی ہے کہ آپ صبح ناشتے سے رات سوتے تک جو الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ عربی کے ہیں۔ اگر آپ عربی الفاظ اپنی بول چال سے نکال دیں تو ناشتے کی میز سے رات کے بستر تک پہنچ نہیں پائیں گے۔ میرے دوست نے کہا کہ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ میں نے کہا میں جو کہہ رہا ہوں وہ عین حقیقت ہے، وہ بولا کس طرح؟ میں نے کہا اس میز پر جو کپڑا رکھا ہے اور جسے آپ کلاتھ کہتے ہیں، وہ لفظ کاٹن سے بنا ہوا ہے، جسے عربی میں قطن کہتے ہیں، چونکہ آپ کے یہاں کاٹن کا متبادل لفظ نہیں، اس لئے اسے بگاڑ کر بول رہے ہیں۔ آپ کے یہاں شگر (چینی) کا نعم البدل لفظ نہیں۔ آپ کے یہاں مارملید جو ناشتے میں استعمال ہوتا ہے، اس کے لئے انگریزی لفظ نہیں۔ اور اورینج (Orange) اصل میں نارنج ہے، جسے بدل کر

Marfat.com

آپ نے نام آرینج رکھدیا۔ یوں آپ کی روزمرہ زندگی کی ہر چیز کا عربی زبان سے واسطہ ہے۔

بے شک جیساکہ میرے قابل و محترم دوست نے کہا کہ کپڑا، کاغذ اور کندیل (قندیل) وغیرہ سب الفاظ عربی کے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ باتیں زیادہ اہمیت کی حامل نہیں۔ ماضی میں مسلمانوں نے جو چیزیں ایجاد کیں، ان کا ذکر کر کے ہم نے اپنا کافی وقت ضایع کیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسلامی دنیا سے یورپ میں یہ ترقی کس طرح منتقل ہوئی۔ یہ بات صحیح ہے کہ قلم کاغذ کے بغیر کوئی حقیقت قلمبند نہیں کی جاسکتی تھی، گھڑیاں کی ایجاد کے بغیر کسی کو وقت کا پتہ نہیں لگتا تھا، زمین کائنات میں قدرت کی اہم چیز ہے، لیکن پہلے کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ سال میں دن کتنے ہیں؟ یہ میں آپ کے سامنے سائنسی حقیقت پیش کر رہا ہوں کہ پہلے ہر جگہ کتنی جہالت اور تاریکی تھی۔ اس کے بعد اب کس طرح علم کی نئی روشنی آئی اور ہر چیز ظاہر ہوتی گئی۔ مائکروسکوپ اور ٹیلی اسکوپ وغیرہ ایجاد ہوئے اور دیگر بہت ساری چیزیں جن کی تاریخ کے بارے میں ہم نہیں جانتے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ سائنسی روشنی اور ترقی اہل یورپ کی طرف کس طرح منتقل ہوئی؟ اس کو آپ ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ پہلے اہل یورپ کو شیشہ بنانے کی ترکیب نہیں آتی تھی۔ انہیں علم نہیں تھا کہ چشمہ کس طرح بنایا جائے۔ لیکن جب مسلمانوں نے اندلس میں شیشہ بنانے کا کارخانہ قائم کیا اور اس کے بعد یہودی اسپنوزا (Spinoza) اور مورس (Moors) کو وہاں سے نکال دیا گیا، جہاں سے وہ ہالینڈ اور جرمنی آکر آباد ہوئے، تو وہاں انہوں نے شیشہ سازی کا کام شروع کردیا۔ چنانچہ اسپنوزا جو یہودی فلسفی تھا، اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے گذر بسر کیلئے آخری ایام میں چشمے بنایا کرتا تھا۔

میرے پاس مطالعے کے لئے بہت کچھ ہے اور اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے کافی کچھ کہا جاسکتا ہے، مگر جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ معمولی باتیں ہیں۔ ہمیں مسلمانوں کی ان ایجادات کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے، جنہوں نے اب کافی ترقی کی ہے۔ آپ اسے راڈر کہیں یا کیبل۔ یہ کیبل کا لفظ مجھے پھر عربی لفظ "حبل" یاد دلاتا ہے، جسے آپ رسی کہتے ہیں، اسی طرح لفظ "ایڈمرل" امیرالبحر کی بگڑی ہوئی شکل ہے، لیکن یہاں اصل اور بنیادی بحث یہ نہیں کہ مسلمانوں نے کیا کیا چیزیں ایجادات کیں اور کیا چیزیں ایجادات نہیں کیں، بلکہ بنیادی سوال یہ ہے کہ اس وقت مسلمان ایجادات نہیں کر رہے ہیں؟ اور کیا وجہ ہے کہ ساری سائنسی ترقی اور ایجادات اہل یورپ کر رہے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ان کو یہ علم نہیں کہ ان ایجادات کا استعمال کس طرح کیا جائے۔ یہ اس حقیقت کو فراموش کرنے کا نتیجہ ہے' کوئی یہ سوچنے کے لئے تیار نہیں کہ عربوں نے کیوں سائنسی طریقہ شروع کیا اور اس کا مقصد کیا تھا، ان کو اس حقیقت کی طرف کس نے راغب کیا، ان کے سائنسی مشاہدات و تجربات کا مقصد کیا تھا، یہ بات مسلمانوں نے بالکل بھلا دی۔ انیسویں صدی تک یورپ میں سائنسی تحقیقات کا جنون تھا، اس کے بعد طاقت کے نشے میں آکر اس نے اس حقیقت کو بھلا دیا۔ یہ وہ بات ہے جو کومپٹ آگسٹ (Compte August) نے انیسویں صدی کے آغاز میں کہی تھی۔

کومپٹ آگسٹ فرانسیسی دانشور تھا، وہ کہتا ہے کہ اب معقول عقیدے کے دن ختم ہوگئے، نیا دور آگیا ہے، جس میں علم، عقل اور مشاہدات کے معیار اور کسوٹی پر ہر چیز کو پرکھ کر حاصل کیا جاسکتا ہے، اس لئے آپ اپنا وقت مذہبی جھگڑوں میں ضائع نہ کریں، عربوں کی طرح باقاعدہ سائنسی علوم حاصل کریں۔ مگر غلطی یہ ہوئی کہ وہ ایجادات کرتے گئے، لیکن مقصد بھلا بیٹھے۔ یہ

Marfat.com

ناکامی مسلمانوں کی تھی یا اہل یورپ کی؟ یہ اولین ناکامی مسلمانوں کی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب انگریز یہاں آیا تو اس نے ہماری کچھ خراب عادات بھی اپنالیں۔ اسی طرح ہم نے صرف ان کی خراب باتیں ہی نہیں سیکھیں، اچھی باتیں بھی ان سے حاصل کیں۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مسلمانوں نے زوال کے زمانے میں سائنسی مقصد اور طریقہ کار کو چھوڑ کر علم فلکیات کی بجائے علم نجوم میں دلچسپی لی۔ انہوں نے علم نجوم میں دلچسپی اس بنا پر لی کہ وہ معلوم کر سکیں کہ کونسا وقت جنگ کے لئے موزوں اور مناسب ہے۔

انہوں نے سوچا کہ سائنسی علوم اور تجربات سے کیا حاصل ہوگا؟ انہیں صرف اس بات سے سروکار تھا کہ کسی نہ کسی طرح یہ معلوم ہوجائے کہ اس کام کا نتیجہ اچھا نکلے گا یا خراب؟ اور ظاہر ہے یہ چیزیں سائنسی تحقیقات و ٹیکنیکل ایجادات سے معلوم نہیں ہوتیں، اس لئے انہوں نے علم جفر اور علم نجوم کو زیادہ اہمیت دی۔ یہی حال انہوں نے علم کیمیا کے ساتھ کیا۔ علم کیمیا کے تجربات سے ان کو صرف الکوہل، الکلائین، بینزائین اور ایسی دیگر ادویات حاصل ہوئیں۔ انہوں نے سوچا کہ ان سے ہم فوراً مالدار نہیں بن سکتے۔ مالدار بننے کے لئے ضروری ہے کہ عام معدنی اشیاء کو سونے میں بدل دیا جائے۔ اس لئے ان کے سارے کیمیاوی تجربات کا محور اور مرکز یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح تانبے اور پیتل کو سونے میں تبدیل کیا جائے۔ ظاہر ہے آپ کو اگر سونا مل جائے تو پھر اور کیا چاہئے؟

ہمارے یہاں مرشد حضرات اپنے مریدوں اور معتقدوں سے کہتے ہیں کہ بابا! لطائف کی منزل ہم نے تجھے طے کرادی، ذکر واذکار کے طریقے بتادیئے، اب آپ نئی چیزیں دیکھیں گے اور کشف و کرامات ہوں گی اور آپ کے اندر ایک نئی

Marfat.com

قوت جنم لے گی، لیکن اس کا استعمال نہ کرنا۔ اگر آپ نے اس کا استعمال شروع کیا تو اس کا جوہر بالکل ختم ہوجائے گا۔ مرشد اپنے مرید کو اس طرح کی ہدایت کرتا ہے۔ لیکن مرید اور خلفاء کیا کرتے ہیں، جوں ہی معمولی قوت انہیں ملی، وہ اپنے کمالات دکھانا شروع کر دیتے ہیں، وہ مختلف لوگوں کا علاج شروع کر دیتے ہیں۔ لوگوں سے کہتے ہیں کہ میں تمہیں نیند میں سلا سکتا ہوں، ہپناٹزم کرتا ہوں۔ اس طرح اس حاصل کردہ قوت کا غلط استعمال کرتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے کمال کی قوت پر پردے پڑ جاتے ہیں، آناً فاناً اندھیرا چھانے لگتا ہے اور صوفی ازم ختم ہوجاتا ہے۔

یہ ہے مسلمانوں کا رویہ علم کیمیا، علم نجوم اور تصوف کے ساتھ۔ نیوٹن جیسے سائنسدان نے بھی جادو اور علم نجوم سیکھے، کیونکہ یہ سائنسی علوم تھے۔ یورپ میں بھی سونے کی تلاش کے لئے بڑی بڑی لیبارٹریز قائم ہوئیں، مگر جب یہ طریقہ کامیاب نہ ہوا تو انہوں نے اس سلسلہ کی ساری کوششیں ترک کر دیں اور اپنی کوششوں کو نیا رخ دیا۔

مسلمان جنہوں نے حقیقی مقصد کیلئے مشاہدات کا آغاز کیا، ان میں یہ شوق کس طرح پیدا ہوا؟ اہل یورپ کو یہ بات معلوم تھی، میں نے ایک بڑے یورپی مصنف کی تصنیف دیکھی ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم کوئی سائنسی دعویٰ نہیں کرتے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایجادات مسلمانوں نے کیں اور انہوں نے ہی ہمیں ان کی طرف متوجہ کیا۔ اگر ہم کسی سائنس کو اپنا کہہ سکتے تو وہ باٹنی یعنی نباتات ہے، کیونکہ اس کے بارے میں انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ان گلسوسن کو زمین پر دیکھو، وہ سالومن (Soloman) سے زیادہ خوبصورت انداز میں بکھرے پڑے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم نباتات ہماری سائنس ہے، لیکن دوسری سائنس کے بارے میں

ہمارے پاس دعویٰ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

مسلمانوں میں اشیاء کی تحقیقات صرف فطرت کے مشاہدے کے تحت نہیں ہوئی، بلکہ ایک مذہبی حکم کے طور پر ہوئی۔ قرآن مجید میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کے نام سے سورتیں نازل ہوئیں ہیں، مثلاً النحل (شہد کی مکھی) العنکبوت (مکڑی) النمل (چیونٹی) وغیرہ۔ ان سورتوں میں کائنات کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں مشاہدات کی تعلیم دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان میں غور وفکر کرو گے تو تمہیں اللہ کی نشانیاں نظر آئیں گی۔ اسی بنا پر مسلمانوں نے حقائق کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور اس کے لئے سائنسی طریقے اور ذرائع استعمال کیے، نہ صرف اتنا بلکہ انہوں نے تاریخ اور آرکیالوجی کو بھی مذہبی سائنس قرار دیا، مگر اس وقت یہ تحقیقاتی رجحان مسلمانوں سے ختم ہوگیا ہے۔ اور اہل یورپ جن کی بھی طویل تاریخ ہے انہوں نے بھی اس طرح کے مشاہدات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

میرے ایک دوست نے حیدرآباد دکن کی یونیورسٹی سے محمد بن قاسم پر ایک مضمون میرے پاس بھیجا ہے۔ میں نے وہ پڑھا۔ ایک اور دوست نے جس نے ابھی یہاں تقریر بھی کی، تاریخ پر کافی لکھا ہے اور تاریخ کے مطالعہ کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے۔ میں نے فطرت کی تاریخ بھی پڑھی ہے کہ مسلمان ترقی کیوں نہیں کرتے، اس کے کیا اسباب و وجوہات ہیں؟ اس کے طویل سیاسی عوامل و عوارض بھی ہیں جو بہت گہرے ہیں۔

ایک عرب مصنف لکھتا ہے کہ مسلمانوں میں تنازعہ کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ امیر معاویہؓ نے اسلام کو تاخیر سے قبول کیا۔ اس وجہ سے ان کی تربیت سابقین اولین کی طرح نہ ہوسکی اور یہ تعجب خیز امر بھی نہیں کہ ابوسفیان کا خاندان اسلام کے مثالی سیاسی نظام کو تبدیل کرنے کے لئے کافی تھا، انہوں نے

Marfat.com

یہ عمل حضرت عثمانؓ کے زمانے سے شروع کیا۔ محمد بن قاسم کی اسلامی تاریخ میں زبردست خدمات ہیں۔ ۱۷ سال کا یہ نوجوان ایران کا طویل رستہ طے کر کے، سندھ کو فتح کرتا ہوا ملتان پہنچتا ہے۔ اس کے بعد وہ کشمیر اور افغانستان کی سرحدوں کی طرف آگے بڑھتا ہے، مگر ان شاندار کامیابیوں کا اسے صلہ کیا ملتا ہے؟ تین سال بعد مسلمانوں کا خلیفہ بدل جاتا ہے، ذاتی انتقام اور دشمنی کی آگ بھڑکنا شروع ہوتی ہے، محمد بن قاسم کو دمشق واپس بلا کر اذیتیں دے دے کر مار دیا جاتا ہے۔ یہی حال اسپین میں ہوا۔ طارق بن زیاد کے بارے میں آپ نے پڑھا ہے کہ وہ جبلراٹر کے مقام پر اپنی کشتیاں جلا کر آگے کی طرف بڑھا اور پورے اسپین کو فتح کرتا ہوا وہاں اسلام کا علم گاڑھا دیا۔ لیکن ان عظیم کامیابیوں کی قدر کرنے کی بجائے اس کا سپہ سالار اعظم موسیٰ اسے طلب کر کے جیل میں بند کر دیتا ہے۔ جب بغداد کے خلیفہ کو موسیٰ کے اس طرز عمل کا پتہ لگتا ہے تو بلوا کر اسے ذلیل کرتا ہے اور جیل میں ڈال دیتا ہے۔ سسلی میں بھی یہی کچھ ہوا۔ ان تنازعات، خاندانی دشمنیوں، رقابتوں اور رنجشوں نے اسپین، سسلی، بغداد کی حکومتوں کو ختم کر کے رکھ دیا۔

مسکین امیر حسن صدیقی نے تاخیر سے "ہسٹاریکل پاکستان ریویو" میں مضمون لکھا جو پڑھنے کے لائق ہے۔ اس میں آپ پڑھیں گے کہ عباسیوں نے اپنے حریفوں سے حکومت کس طرح چھینی؟ تاریخ کے جب یہ اوراق ہم پڑھتے ہیں تہ مارے شرم کے ہماری گردن جھک جاتی ہے۔ یہ لاپرواہی نہیں بلکہ حسد، تنگ نظری اور اندھی دشمنی کی تاریخ ہے۔ جس کے دوران مسلمانوں نے قرآن مجید کو پس پشت ڈال کر، اپنی زندگی کے مقصد کو ترک کر کے، سائنس، فلسفہ اور تاریخ

Marfat.com

کو چھوڑ کر سیاسی مفادات کی خاطر لڑنے لگے۔ ان کارناموں کی وجہ سے وہ لوگ پہلے درجے کے انسان سے گر کر تیسرے درجے کے شہری بن گئے۔ یہاں تک کہ ان کو اسپین، سسلی، بغداد میں نہایت برے دن دیکھنے پڑے، کیونکہ انہوں نے اپنی حیثیت بالکل بھلادی۔ بہر حال یہ پرانی مگر افسوسناک سیاسی تاریخ ہے۔

میرے پاس وقت نہیں، ورنہ میں آپ کو بتاتا کہ آرکیالوجی کیا ہے اور وہ کس طرح وجود میں آئی، تاریخ اور سائنس کس طرح وجود میں آئی اگر زندہ رہا تو آپ کو بتاؤں گا۔ تھوڑی دیر کے لئے آپ میری بات پر یقین کریں کہ اس پوری سائنس کی اساس قرآن مجید ہے۔ لیکن مسلمانوں نے جو غلطیاں کی ہیں، یہ ان کی اپنی غلطیاں ہیں قرآن مجید کا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے کیونکہ بعد میں مسلمانوں نے اللہ اور اس کی کتاب کے ایک حصے کو یکسر بھلادیا اور اس کی تعلیمات پر کوئی توجہ نہیں دی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو مختصر عرصہ کے لئے دنیا کی عظیم الشان سلطنت کی حکمرانی عطا ہوئی۔ آپ نے دنیا کی خوبصورتیوں کو دیکھتے ہوئے فوراً فرمایا کہ میں نے دنیا کی ظاہری چمک دمک میں وہ کچھ بھلادیا، جو مجھے بھلانا نہیں چاہئے تھا۔ مگر افسوس! مسلمانوں کو صدیوں کی غفلت اور لاپرواہی کے باوجود ابھی تک یہ احساس ہی نہیں کہ ہمارا اصل مقصد اور حقیقی منزل کیا تھی اور ہم اس سے کتنا دور بھٹک گئے ہیں؟

معمولی درجہ کی ایجادات کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں۔ یہ صرف ایجادات ہی نہیں جو مسلمانوں نے دنیا میں متعارف کرائیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کرنے

Marfat.com

انقلاب کی وہ روشنی ہے جو مسلمان دنیا میں لائے، جس سے دنیا نے زندگی کی نئی اقدار اور نئے اطوار اور طریقے سیکھے اور اقوام عالم کو علم ہوا کہ زندگی کس طرح بسر کی جائے۔ یہ پورا سسٹم اس چھوٹی سی کتاب میں موجود ہے جس میں چھ ہزار آیتیں ہیں۔ ان چھ ہزار آیات نے دنیا میں لاکھوں دوسری آیات کو جنم دیا۔ کیونکہ مسلمانوں کو بنیادی تعلیم یہ دی گئی کہ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیَاتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ (ترجمہ) بے شک زمین اور آسمانوں کی تخلیق اور گردش لیل و نہار میں عقلمندوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک حکم تھا ان آیات کو پڑھنے کا، جو کائنات میں ہر طرف لاکھوں کی تعداد میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لئے وہ ایجادات اور کام کرنے والے آلات جو عربوں نے ایجاد کئے، معمولی چیزیں ہیں۔ اصل اہمیت اس انقلاب عالم کی ہے جو قرآن مجید کی تعلیم کے نتیجے میں عربوں نے دنیا میں برپا کیا۔ علم کی جو روشنی وہ لائے، تہذیب و ثقافت کی جو بنیادیں انہوں نے فراہم کیں، لکھنے پڑھنے کا جو رجحان انہوں نے پیدا کیا، وہ جوہری اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ علم ریاضی کا مطالعہ ہی تھا، جس کی وجہ سے پوری کائنات آج انسانی تحقیقات کے احاطہ میں ہے۔ اس نکتہ کو آپ اس وقت تک سمجھ نہیں سکتے جب تک ریاضی کو نہیں پڑھتے۔ اس لئے پہلے مسلمان علماء کے لئے علم ریاضی ضروری ہوتا تھا۔ کسی عالم کو اس وقت تک قدر و وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا، جب تک وہ علم ریاضی نہ پڑھتا۔ ریاضی کے بغیر وہ پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے یہ معلوم کرلیا کہ دھرتی کیا ہے۔ قرآن مجید نے پہلے ہی ارشاد فرمادیا تھا کہ زمین ایک سیارہ ہے اور ہر سیارہ

Marfat.com

اپنے اپنے فلک میں گردش کر رہا ہے۔ ان اشیاء اور اجرام فلکی کا مطالعہ کس طرح کیا جائے؟ قرآن مجید میں اس کے لئے اشارات موجود تھے۔ انسانی وجود کے آغاز سے انتہا تک قرآن مجید نے رہنمائی فراہم کی۔ خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ (سورة الحج پ۱۷) خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا (الكهف پ۱۵) - وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا (نوح پ۲۹) - لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (الانشقاق پ۳۰) ان الٰہی ارشادات کی رہنمائی میں مسلمانوں نے کائنات کا مطالعہ شروع کیا اور وہ آگے بڑھتے گئے۔ نباتات سے کائنات تک انہوں نے ہر چیز کا مطالعہ کیا۔ قرآن نے ہمیں بتایا کہ انسان کو کس طرح مٹی سے پیدا کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے: انبتكم من الارض نباتا اس نے تمہیں زمین سے اس طرح پیدا کیا، جس طرح نباتات کو پیدا کیا جاتا ہے۔ یوں ارتقاء کے تفصیلی مطالعے کے لئے بنیادیں فراہم کی گئیں۔ لیکن افسوس! موجودہ زمانے میں مسلمان کہتے ہیں کہ یہ غیر اسلامی فعل ہے، اس سوچ کی بنا پر مسلمانوں کی پچھلی ساری علمی تاریخ غیر اسلامی ہوگئی، کیونکہ وہ مسلمان ہی اب باقی نہ رہے، جو قرآن مجید کے ان ارشادات اور سائنسی اشارات کو سمجھ سکیں۔ خدارا! کائنات کے اس مطالعے اور اس کے مشاہدات کو غیر اسلامی نہ کہیں۔ اسلامی تاریخ ابھی لکھی جائے گی۔ یہ مسلمانوں کی تاریخ نہیں، بلکہ یہ اس سے مختلف ہے، ایسی تاریخ جس میں قرآنی فکر ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، بڑی دردناک ہے۔ مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات سے انحراف کر کے اپنے لئے تباہی اور بربادی کا سامان پیدا کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری ایام میں حجتہ الوداع کے موقع پر صاف الفاظ میں فرمایا تھا: لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض (بخاری) (ترجمہ) میرے بعد پلٹ کر کافر مت بن جانا کہ ایک دوسرے کی

Marfat.com

گردنیں مارنا شروع کر دو، لیکن کیا انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک پر عمل کیا اور آپس میں لڑائی جھگڑا شروع نہ کیا۔ ہمارے پروفیسر ڈاکٹر بلوچ صاحب بجا طور پر لکھتے ہیں کہ حجاج بن یوسف اور اس کے خاندان سے وقت کے خلیفہ کا بدلہ لینا خونی انتقام نہ تھا تو اور کیا تھا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے آدھی صدی بعد کے واقعات ہیں، جس کے نتیجے میں پھر جاہلیت کا زمانہ آگیا اور خونریزی کا سلسلہ اس حد تک بڑھ گیا کہ اس نے مسلمانوں کو تہس نہس کر دیا، ان کی سائنس کو ختم کر دیا۔

اہل یورپ جھوٹ لکھ سکتے ہیں کیونکہ وہاں کوئی مسلمان نہیں جو ان کے جھوٹ کا جواب دے سکے۔ اگر مسلم دنیا میں فقط دس عالم بھی ہوتے تو یورپ والے اتنے احمق نہ تھے کہ ایسی باتیں لکھتے، وہ شرمسار ہوتے۔ لیکن انہیں معلوم تھا کہ مسلمانوں میں دس عالم بھی نہیں، جو ان کی غلطیوں کی نشاندہی کر سکیں۔ وہ سچ کیوں لکھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارا کام نہیں کہ مسلمانوں کو بتائیں کہ آپ نے ہمیں کیا سکھایا ہے۔

قوم پرستی اور نسل پرستی کے اس دور میں دوسرا اپنے مخالف کو یہ کیوں بتائے گا کہ تم نے یہ یہ چیزیں ایجاد کیں۔ وہ اسے ترقی کرتا ہوا کس طرح گوارہ کرے گا، اس کی تو یہی کوشش ہوگی کہ وہ اندھیرے میں رہے۔ وہ تو یہی کہے گا کہ یہ میری ذمہ داری نہیں کہ میں انہیں روشنی دکھاؤں۔ اس لئے ہم انہیں الزام نہیں دھرتے۔ ابن خلدون نے تاریخ لکھی اور اس کے مقدمہ میں تاریخ کا فلسفہ بیان کیا، جو مسلمانوں کے لئے بڑا سائنسی سرمایہ ہے۔ مگر آج کل وہ بگڑی ہوئی کہانی کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ مسلمانوں کے لئے تاریخ ایک مذہبی سائنس ہے۔ پہلے ہر چیز کی حقیقت کو اس کی سچائی کے پس منظر میں دیکھا جاتا تھا۔ عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر مشاہدات کیے جاتے تھے اور ہر چیز کا

Marfat.com

صحیح رکارڈ رکھا جاتا تھا کیونکہ اس کے بغیر تاریخ لکھی نہیں جاتی تھی، جس طرح اسلام سے پہلے لوگ صرف قصے کہانیاں اور آپ بیتیاں لکھتے تھے مگر مسلمانوں نے ہر چیز کو سائنسی معیار پر پرکھ کر لکھنا شروع کیا۔ صحیح اور مکمل مشاہدے سے جب حقیقتیں ثابت ہوجاتی تھی تو پھر اسے تحریر کی صورت میں لاتے تھے، کیونکہ قرآن مجید نے اصولاً حکم دے دیا تھا کہ فَتَبَیَّنُوْا (الحجرات) (ترجمہ) ہر بات کی پہلے تحقیق کرلیا کرو۔ اجرام سماوی کی تحقیقات کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ * ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ (الملک پ۲۹) (ترجمہ) نگاہ اٹھاکر دیکھو کہ آسمانوں میں تمہیں کوئی دراڑ نظر آتی ہے۔ پھر دوبار نگاہ اٹھاکر دیکھو یعنی بار بار تحقیقات کرو اور حقیقت کی گہرائی تک پہنچو۔ افسوس! صد افسوس!! مسلمانوں نے قرآن مجید کی اس تعلیم کو پس پشت ڈال دیا۔ وہ اقتدار کی کشمکش، دولت کی لالچ اور انتقام کی سیاست میں الجھ گئے۔ حالانکہ مسلمانوں میں بہت سی خوبیاں تھیں، جو انہوں نے اہل یورپ کو دیں، جن کا اب تک ذکر کیا جاتا ہے اور کیا جانا چاہئے۔ ایک زمانہ میں مسلمانوں کا نعرہ تھا کہ لَا غَالِبَ اِلَّا اللّٰهُ (ترجمہ) اللہ تعالیٰ کے سواء انسانوں پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ یہ تاریکی کا دور بھی نہ تھا، علم کی کافی روشنی موجود تھی، کیونکہ بصورت دیگر وہ ایک ہزار سال مکمل اندھیروں میں رہتے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر حکمران اقتدار کے نشہ میں مست تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں عبدالرحمن یا عبدالعزیز پیدا ہوگا یا نہیں جو اس صورتحال کو آکر ختم کردے، جوان بے وقوفوں کی پیدا کردہ ہے؟ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی غالب اکثریت حکومت و اقتدار کے پیچھے لگی ہوئی ہے، جس طرح آپ آج کل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

اسی وجہ سے میں کہا کرتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کے سائنسدانوں، تاریخ

Marfat.com

دانوں، سیاستدانوں اور حکمرانوں نے ایک چیز کو بالکل فراموش کر دیا ہے اور وہ ہے قرآن مجید۔ اللہ تعالیٰ کی اس پاک کتاب میں جو کچھ ہے وہ معمولی نہیں۔ قرآن مجید میں دیے گئے طریقے اور اشارات میں ہدایت اور رہنمائی کے وہ انتظامات ہیں جو اندھے انسان کے لئے کافی ہے۔ اگر آج بھی اس پر عمل کیا جائے تو مسلمان وہ چیزیں ایجاد کر سکتے ہیں جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس! اس کتاب کو پس پشت ڈال کر ایک کونہ میں رکھ دیا گیا ہے۔ یہ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ آج سادہ لوح لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا ہمیں سائنسی طور پر ترقی کرنی چاہیئے؟ وہ کہتے ہیں کہ سائنس نے دنیا میں الجھنیں پیدا کی ہیں۔ سائنس مذہب کے خلاف ہے۔ جب میں اس طرح کے الفاظ سنتا ہوں تو پکارنے لگتا ہوں کہ اے اللہ! میں عقلمندوں میں رہتا ہوں یا پاگلوں کی دنیا میں؟ اس ذہنیت کے لوگ امریکہ میں رہتے ہوں یا یورپ میں۔ افریقہ کے رہنے والے ہوں یا ایشیا کے، پاگلوں کا یہ انبوہ کہتا ہے کہ مذہب اور سائنس دو متضاد چیزیں ہیں، سائنسی ذہنیت رکھنے والے آدمی کو معاشرہ سے نکال دینا چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم و عقل کی تائید کی ہے۔ قرآن مجید عقل اور سائنس پر زیادہ سے زیادہ زور دیتا ہے۔

بعض لوگوں کو صرف یہ دھن ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح ماہرین نجوم بن جائیں، تاکہ علم نجوم و جفر میں صلاحیت کی وجہ سے لوگوں سے ان کا مال بٹورا جا سکے یا علمِ کیمیا کی بدولت اشیاء کو سونے میں بدل دیا جائے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ مسلمانوں کو زر پرستی کی یہ روش اور یہ ہوس چھوڑنا پڑے گی۔ آپ کو سائنسی ترقی کی طرف آنا پڑے گا۔ قرآن کے الفاظ میں حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ (ترجمہ) یہاں تک کہ تیرے پاس یقین آجائے۔ آپ کو سائنسی حقائق کی روشنی کی طرف آنا پڑے گا۔ دولت حاصل کرنے کے سستے اور سطحی طریقے اختیار کرنے

Marfat.com

کی بجائے آپ کو سائنسی میدان میں محنت اور مشقت کرنا پڑے گی۔ وَاللّٰہُ مَعَ الصَّابِرِیْنَ (ترجمہ) اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یعنی اپنے اندر محنت کرنے اور صبر کرنے کی عادت ڈالیں۔ قرآن نے ترقی کرنے کا جو معیار مقرر کیا ہے، اسے ذہن نشیں کریں اور اس راہ پر چلنے کی کوشش کریں۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں اول تو علم حاصل کرنے کا تناسب ہی کم ہے اور جو لوگ علم حاصل کرتے بھی ہیں تو وہ اطاعت کے جذبے کے تحت نہیں، بلکہ ادنیٰ درجہ کے دنیاوی مقاصد کے لئے حاصل کرتے ہیں، جیساکہ اس وقت اپنی آنکھوں سے ہم اپنے معاشرہ کی حالت زار دیکھ رہے ہیں کہ پیسے حاصل کرنے کے لئے انسان انسان کو قتل کر رہا ہے۔ یہ جنون اور یہ خفقان جو آج پوری شدت سے ہمارے یہاں جاری ہے، وہ چھ سات صدیوں سے جاری ہے۔ بس ہر شخص کو ایک ہی فکر کھائے جارہی ہے کہ دولت کس طرح کمائی جائے۔ کوئی سوچتا ہے کہ میں جادوگر بن جاؤں، کسی کو یہ فکر ہے کہ میں ماہر نجوم بن جاؤں اور کوئی کسی راہ پر گامزن ہے۔ بہرحال آپ جو بھی بن جائیں لیکن مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیں کہ یہ سائنس نہیں، یہ قرآن نہیں، یہ علم اور روشنی نہیں، بلکہ یہ تاریکی ہی تاریکی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں ظلمات فوق بعض. اندھیرے پر اندھیرا۔

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے ایک بار پھر قرآن مجید کی طرف پلٹ کر آئیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مطالعہ کس طرح کیا جائے۔ کس چیز کا مطالعہ کیا جائے؟ اور اس کے کیا فوائد ہیں؟ قرآن مجید کا مطالعہ ادنیٰ درجہ کی چیزوں اور معمولی نوعیت کی ایجادات کے لئے نہیں کرنا ہے۔ بلکہ مطالعہ کے ذریعے اس سے بھی بڑی چیز حاصل کی جاسکتی ہے، آپ کو انسان ہی نہیں، انسان سے بھی ارفع واعلیٰ بننا ہے۔ یہ سب آپ الکتاب کے مطالعہ سے کرسکتے ہیں۔

Marfat.com

چنانچہ میرے نزدیک اس چیز کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں کہ میں مسلمانوں کی ایجادات کا بیان کرتا پھروں کہ یہ سب کچھ مسلمانوں نے ہی ایجاد کیا اور دور جدید کے انسانوں کا اس میں کچھ بھی حصہ نہیں۔ دعوی کرنا مسلمان کا کام نہیں۔ یہ سطحی لوگوں کا کام ہوتا ہے کہ وہ یہ رٹ لگاتے ہیں کہ "پدرم سلطان بود"۔ یعنی میرا باپ بادشاہ تھا؟ آخر اس سے کیا حاصل؟ میرے آباؤ و اجداد جو بھی تھے، وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ مجھے تو اپنا حسابِ دینا ہے۔ جب تک میں اچھی اقدار پر قائم نہ رہوں، صراط مستقیم پر نہ چلوں، زندگی کے معیار کو بلند نہ کروں، اس وقت تک میں کس طرح اچھا انسان کہلاسکتا ہوں؟ صرف "پدرم سلطان بود" سے مسئلہ تو حل نہ ہوگا۔ عربوں نے جو ایجادات کیں، ان سے آخر کیا حاصل ہوگا؟ بہر حال یہ بات مسلمہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ قرآن کی رہنمائی سے کیا اور اگر قرآن سے بدستور رہنمائی لیتے رہتے اور سائنسی تسلسل کو برقرار رکھتے تو اس سے سیکڑوں درجے زیادہ ترقی کرتے۔ یہاں مجھے علماء نظر آتے ہیں، میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ ہمیں بتائیں کہ قرآن کی روشنی میں مسلمان کس طرح ارتقاء کر سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں قرآن کن اقدار کا تعین کرتا ہے؟ قرآن ہمیں تاریخ کے مطالعے کے لئے کیا رہنمائی دیتا ہے؟ علم ریاضی کے بارے میں کیا نظریات پیش کرتا ہے؟ اس علم کی تحصیل میں وہ ہماری کیا مدد کرتا ہے؟

قرآن مجید ایک کھلی کتاب ہے۔ اس میں کوئی ابہام اور الجھاؤ نہیں۔ صرف اسے پڑھنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر افسوس! کوئی اسے پڑھنا ہی نہیں چاہتا، اس کی تعلیم پر عمل پیرا ہونا نہیں چاہتا اور یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ دنیا والے جب تک قرآنی تعلیمات پر کاربند نہ ہوں گے، اس وقت تک راہ نجات حاصل نہیں کر سکتے۔

عظیم جرمنی فلسفی گوئٹے نے ہمارے مفسرین اور دنیا کے دوسرے

Marfat.com

دانشوروں کی توجہ قرآن مجید کے ایک اہم نکتہ کی طرف مبذول کرائی ہے کہ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ (ترجمہ) اپنے رب کی عبادت کرو یہاں تک کہ تمہیں یقین حاصل ہوجائے۔ عام مفسر حضرات یہاں "یقین" سے "موت" مراد لیتے ہیں۔ لیکن گوئٹے کہتا ہے کہ اس کا مطلب "ایمان کامل" ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ گوئٹے کے اس نظریہ پر غور کریں۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ گوئٹے نے یہ نصیحت اہل یورپ کو کی تھی۔ گوئٹے کے یہی الفاظ کارلائل نے انگلینڈ میں کہے کہ وہ عرب انسان جسے آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں، اگر اسلام کے یہی معنی بتارہا ہے تو پھر ہمیں اس اسلام کو اپنانا چاہیئے، لیکن جیساکہ میں نے کہا اقتدار انسان کو اندھا کردیتا ہے، اس لئے اہل یورپ میں بے اعتقادی پیدا ہوگئی، پس اب ایک نئے حکیم اور دانشور کی ضرورت ہے۔

یہاں موجودہ حضرات میں سے پانچ فیصد افراد بھی لوگ میری باتوں پر توجہ نہیں دیں گے، شاید وہ کہیں کہ یہ ایک ملا ہے جو پرانی کتاب کی پرانی باتیں ہمیں بتارہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے تئیں صحیح ہوں، لیکن وہ وقت آنے والا ہے جب یہ ثابت ہوجائے گا کہ: یَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (ترجمہ) اے میرے اللہ! میری اس قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا، اسے پس پشت ڈال دیا، اس بات کو آنے والے وقت کا تسلسل ثابت کررہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ پرانی کتاب ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ خارج از وقت کتاب نہیں۔ یہاں میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں، جس نے مجھے پیدا کیا کہ اللہ کی اس کتاب میں وہ حقیقتیں موجود ہیں، جو مشرق و مغرب کی کسی کتاب میں موجود نہیں۔ میں لوگوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ قرآن مجید کے مقابلے میں کوئی کتاب لاکر پیش کریں۔ قرآن کے الفاظ میں: اِیْتُوْنِیْ بِکِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (ترجمہ) یعنی اس کے مقابلے میں کوئی علمی کتاب یا

علمی آثار پیش کرو، اگر تم سچے ہو۔ جو کچھ آپ موجودہ صدی میں دیکھ رہے ہیں، وہ اسی قرآن کی برکت ہے۔ نیز اس میں دس دس ہزار حقیقتیں مزید مضمر ہیں، جن کو ابھی تک کسی نے نہیں جانا، یہ حقیقتیں دانا بینا افراد ہی دیکھ سکتے ہیں۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (ترجمہ) اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری پر قائم رہیں، جب تک تیرے پاس یقین آئے، اور وہ وقت بتدریج آئے گا اور اچانک نہیں آئے گا۔

اب میں آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا۔ میرے بھائیو اور بہنو! میں بڈھا اور خارج الوقت آدمی ہوں، میں بالکل بیکار ہوں، نہ کمیونزم کی بات کرتا ہوں اور نہ سوشلزم کی۔ نہ سیاست پر بولتا ہوں اور نہ حکومت کے بارے میں۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ اپنا وقت ضائع کر کے کیوں ہمیں عزت دیتے ہیں۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ شاید آپ وقت ضائع کر رہے ہیں کیونکہ یہاں ملاازم پر بات کی جارہی ہے جو فضول ہے، اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرے۔

Marfat.com

# شاہ ولی اللہ اور اخلاقیات

خواتین و حضرات! پہلی بات آپ کی اجازت سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی آپ اس گفتگو میں دلچسپی رکھتے ہیں یا نہیں؟ اگر دلچسپی نہیں ہے تو پھر یہ آپ کے لئے اور خود میرے لئے بھی تضیع اوقات ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ اہم موضوع ہے، مگر آپ کے لئے بھی یہ اہم معلوم ہوتا ہے یا نہیں؟

تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر ہالیپوتہ صاحب نے آسان، مگر ادبی الفاظ میں اخلاقیات پر گفتگو کی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کائنات میں کسی بھی چیز کی حرکت اور روش کو اخلاقیات کہتے ہیں۔ ہر چیز کسی نہ کسی طرح اپنا کردار ادا کر رہی ہے، خواہ وہ درخت ہو یا انسان۔ پوری کائنات کی رفتار کو اخلاقیات کے دائرے میں لایا جاسکتا ہے۔ اگرچہ Ethics (اخلاقیات) یونانی لفظ ہے، محدود معنوں میں مستعمل ہے، اردو میں اس کے لئے لگ بھگ "رسم و رواج" کے الفاظ آتے ہیں، جس میں لوگ کسی نہ کسی خاص طرز عمل سے کوئی کام سرانجام دے رہے ہیں۔ "اتھک" کا مطلب ہے کہ یہ کام کیا گیا اور یہ نہیں کیا گیا۔ اگر کوئی شخص ایسا کام کرے، جسے دوسرے پسند نہ کریں تو انگریزی میں کہتے ہیں کہ "مہربانی!" یا یہ کہ ٹھیک ہے۔ قرآن کی زبان میں اسے معروف و منکر کہا جاتا ہے۔ "معروف" نیکی کا وہ کام ہے جو سب کے لئے پسند ہے۔ منکر برائی کا وہ کام جس سے نفرت کی جاتی ہے۔ الغرض ہمارا اور آپ کا طرز عمل خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، خاندانی ہو یا قومی سطح کا، وہ سب اخلاقیات کے زمرے میں آجاتا ہے۔

میں نے اوپر عرض کی کہ ایتھکس یونانی لفظ ہے، جس کی معنیٰ محدود ہیں۔ اردو میں اس لفظ کا مطلب ادا کرنے کے لئے خلق کا لفظ آتا ہے۔ خلق اور

Marfat.com

اخلاق کافی وسیع معنیٰ والے الفاظ ہیں، جس کا مطلب صرف عادت اور چال چلت نہیں، بلکہ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، بود و باش، سماجی طور طریقے، اجتماعی امور اور دنیاوی اور بین الاقوامی معاملات الغرض تمام چیزیں اخلاقیات کے دائرے میں آجاتی ہیں۔ اخلاق کی اسی وسعت کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے کہ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (ترجمہ) میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

ہمارے نزدیک شاہ ولی اللہ قرآن مجید کے درخت کی ایک بڑی شاخ ہے، کیونکہ آپ قرآنی اصطلاحات میں بات کرتے ہیں۔ اس موقعے پر اس طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ قرآنی اخلاقیات اور پچھلی اقوام کی اخلاقیات کے مابین ایک امتیازی فرق ہے۔ یونانیوں کے ہاں جیساکہ ڈاکٹر ہالیپوٹہ صاحب نے کہا چار بنیادی فضائل تھے، جن پر عمل کیا جاتا تھا۔ انہوں نے آپ کو بتایا کہ شاہ ولی اللہ نے ان میں مزید اصول شامل کیے۔ یہاں دیگر فضائل ملانے کا سوال نہیں۔ بلکہ بود و باش اور چال چلن کے اصول تبدیل ہوگئے اور اس بات کو انہوں نے ایک جملے میں یوں بیان کیا کہ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ (ترجمہ) نیکوکاروں کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں۔)

اس کا مطلب کیا ہے؟ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ میرے دوست کے اچھے کام دوسروں کو خراب نظر آتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاقیات کا قانون جامد اور غیر لچکدار نہیں، جس طرح یونانیوں کے چار بنیادی فضائل ہیں۔ اسلام نے دنیا کے سامنے جو ارتقائی نظریہ پیش کیا ہے، اس کے تحت اخلاقیات نے بھی ارتقائی منازل طے کیں۔ ایک شخص کا اچھا عمل دوسرے کے لئے کسی اہمیت کا حامل نہیں، یہاں تک کہ وہ اسے خراب سمجھنے لگتا ہے۔ اخلاقی قاعدہ میں اسے نسبت کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

دوسری امتیازی خصوصیت جو اسلامی قاعدے اور ضابطے میں روح کی حیثیت رکھتی ہے، وہ ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ یعنی اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ یعنی اسلام صرف آپ کے اعمال کی ظاہری شکل اور ہیئت کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ یہ بھی پرکھتا ہے کہ اس عمل میں کیا نیت کارفرما ہے؟ پس اصل کسوٹی اور معیار نیت ہے۔

مشہور ہے کہ ایک شخص کا راستہ سے گزر ہوا، اس نے زمین میں ایک لکڑی گاڑھ دی۔ دوسرا شخص وہیں سے گزرا اور اس نے اس لکڑی کو اکھیڑ پھینکا۔ تیسرا آدمی بھی وہاں سے گزرا، اس نے سوچا کہ یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص یہاں سے گذرا تو زمین کھود کر، تکلیف اٹھا کر اس نے زمین میں لکڑی گاڑھ دی۔ دوسرے نے احتیاط سے لکڑی نکال کر ایک طرف پھینک دی۔ سوال یہ ہے کہ دونوں میں اچھا کون ہے؟ تلاش اور تحقیق کرتے ہوئے دونوں کے پاس پہنچا اور کہا کہ مہربانی کر کے آپ حضرات اس بات کی وضاحت فرمائیں کہ آپ دونوں نے ایسا کیونکر کیا؟ دونوں ہنس پڑے۔ ایک نے کہا کہ میں طویل سفر کے بعد یہاں پہنچا تو گھوڑے کو باندھنے کے لئے یہاں کوئی چیز نہیں پائی۔ چونکہ مجھے یہاں کچھ آرام بھی کرنا تھا اور کھانا بھی کھانا تھا۔ اس لئے میں نے ایک طرف لکڑی زمین میں گاڑ کر گھوڑا باندھ دیا۔ اس میں میری یہ نیت بھی کار فرما تھی کہ جب دوسرے مسافر یہاں سے گزریں گے تو اپنی سواری کو باندھیں گے۔ دوسرے نے کہا کہ میرا بھی یہاں سے گزر ہوا، میں نے زمین میں گڑی ہوئی لکڑی دیکھ کر سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کی تاریکی میں کسی کو ٹھوکر لگ جائے اور وہ گر پڑے، اس وجہ سے میں نے مناسب سمجھا کہ لکڑی کو اکھیڑ پھینکوں۔

چنانچہ اسلامی قاعدہ کے مطابق کسی کام کے اچھے یا برے ہونے کے لئے

صرف اتنا کافی نہیں کہ وہ ظاہری اعتبار سے صحیح ہے یا غلط؟ بلکہ اس میں کارفرما نیت کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ عام قانون کے مطابق کسی کام کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ صرف اس کے ظاہر کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ انما الاعمال بالنیات (ترجمہ) اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

ایک شخص ریاکاری کے جذبے کے تحت مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے تو یہ نہایت غلط کام ہے۔ کیونکہ شریعت میں ریاکاری کو شرک خفی کہا گیا ہے۔ دوسرا شخص مسجد سے باہر نکل کر نیکی کا کوئی اہم کام کرنے جا رہا ہے، جسے وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کیونکہ پہلا شخص یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ میں متقی اور پرہیزگار ہوں، جبکہ دوسرا اپنی نیکی کا اظہار اور پبلسٹی نہیں چاہتا، اس وجہ سے وہ عظیم ہے۔

اب آئیے حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ کے اصول کو دیکھیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ایسا ہوتا رہتا ہے کہ ایک انسان کوئی معمولی نیکی کرتا ہے تو وہ اپنی ذہنی سطح کے مطابق اسے بڑی نیکی سمجھنے لگتا ہے، جبکہ کسی دوسرے آدمی کے نزدیک اس کی اس نیکی کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ بعض لوگ نماز، روزے کی پابندی کرتے ہیں اور نیکی کے دوسرے کام بھی کرتے ہیں اور خود کو عزت واحترام کا حقدار بھی سمجھنے لگتے ہیں، جبکہ بعض دوسرے لوگوں کے نزدیک یہ امور اونچی سطح کے حامل نہیں ہوتے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں ایماندار بنوں گا، مگر دوسرا کہتا ہے کہ میں نہ صرف ایماندار بلکہ محسن بنوں گا۔ دنیاوی معاملات میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں ایک مہینہ میں ہزار روپے کماتا ہوں اور یہ رقم میں نے حلال ذریعہ سے حاصل کی ہے اور یہ رقم اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا ہوں۔ اس کے

Marfat.com

مقابلے میں دوسرا شخص کہتا کہ میں نے جو ایک ہزار روپے کمائے ہیں وہ میری ضرورت سے زیادہ ہیں، میں ان میں سے آٹھ سو روپے خود خرچ کروں گا اور دو سو روپے غریبوں، مسکینوں پر خرچ کروں گا۔ یہاں دو مختلف نقطہ ہائے نگاہ ہیں۔ پہلا آدمی بھی صحیح کام کرتا ہے، آپ اسے بے ایمان نہیں کہہ سکتے۔ دوسرا آدمی کہتا ہے کہ یہ فضول خرچی اور بے ناانصافی ہوگی کہ اپنی کمائی میں سے ضرورت سے جو زائد رقم ہے وہ میں اڑوس پڑوس کے غریبوں اور یتیموں پر خرچ نہ کروں، جن کو اتنا بھی نہیں ملتا جو مجھے ملتا ہے۔ اس لئے اپنی ضرورت سے زیادہ خود پر ایک پیسہ بھی صرف نہ کروں گا۔ ان دونوں کے کردار کا معیار اور پیمانہ مختلف ہے اور دونوں کی سوچ میں بین فرق ہے۔

یہ انسانی اخلاق کی ایک ارتقائی صورت ہے، جس پر اسلام اور قرآن مجید زور دیتا ہے۔ اخلاقی ارتقا، انسانی ذہن کی ارتقا سے وابستہ ہے اور جب انسانی ذہن ارتقا کرتا ہے تو کائنات میں ارتقا آجاتا ہے۔ کائنات میں ارتقا کس طرح ہوتا ہے اس کے بارے میں درخت کی مثال پیش کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ درخت زمین میں اپنی جڑیں گاڑ کر تیزی سے پروان چڑھتا ہے اور جو درخت زمین میں اپنی جڑیں گاڑتا ہوا تیزی سے بڑا ہوتا ہے، اسے آپ عمدہ درخت کہتے ہیں۔ مثلاً شاہ بلوط کا درخت ایک ہزار سے پندرہ سو برس تک قائم رہتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حرکت کم کرتا ہے، مگر اپنی جڑیں تیزی سے زمین میں گہری کرتا ہے۔ جس درخت یا پودے کی اپنی جڑیں نہیں ہوتیں وہ دوسرے پر چڑھ جاتا ہے، مثلاً "امر بیل" کی اپنی جڑیں نہیں ہیں، وہ درختوں پر چمٹ جاتی ہے۔ ایسے درخت یا پودے کو کوئی اچھا نہیں سمجھتا کیونکہ وہ اپنی غذا اور خوراک خود حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے وہ دوسروں پر انحصار کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کو بھی چوس کر، کھا کر ختم کر دیتا

ہے، جس پر وہ چپک جاتا ہے۔ اسی عام اصول کے مطابق نباتاتی دنیا میں وہ بیل بوٹے اور درخت اچھے سمجھے جاتے ہیں، جو خودانحصاری کے تحت زمین میں جڑیں گاڑ کر اپنی خوراک تلاش کرتے ہیں۔

اب ہم حیوانی دنیا میں آتے ہیں۔ ہرن بہت تیز دوڑتا ہے۔ عربوں میں جو گھوڑا ہوتا ہے وہ بھی تیز دوڑتا ہے، اس بنا پر اسے عمدہ حیوان کہا جاتا ہے۔ اس موقعہ پر آپ ایک اچھے درخت اور اچھے جاندار کی خصوصیتوں پر غور کریں گے تو آپ کو دونوں میں نمایاں فرق نظر آئے گا۔ درخت میں تحرک نہیں ہوتا، جبکہ اچھا جاندار تیزی اور پھرتی سے حرکت کرنے میں اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے، نہ درخت خراب ہے نہ ہرن اور گھوڑا، مگر دونوں کے خصائص ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اخلاقی ارتقا میں بھی یہی فرق ہوتا ہے۔ آپ کے پاس اخلاقیات کے موضوع پر بہت سی کتابیں ہوں گی، مثلاً "اخلاقِ جلالی"۔ "اخلاقِ ناصری"۔ "اخلاقِ لطیفی" وغیرہ۔ یہ ابتدائی اخلاقی کتب تھیں۔ اب ہمارے پاس "اخلاقِ ولی اللٰہی" کا فلسفہ اور کتابیں ہیں، جو مقدم الذکر کتب کے مقابلے میں زیادہ ارتقائی ہیں۔ گذشتہ صدی میں یورپی مصنفین نے اس حقیقت کا ادراک کیا کہ اخلاق ہی وہ عمدہ اساس ہے، جو ہمیں مذہب مہیا کرتا ہے، بصورت دیگر مذہب کسی کام کا نہیں۔ اسی بنا پر میتھیو آرنلڈ جیسے دانشور کو کہنا پڑا کہ مذہب اور کوئی چیز نہیں، مگر اخلاقی جذبات سے وابستگی اور اخلاقی تعلیمات۔ اخلاقیات کے بارے میں یہ اس کی تشریح اور سوچ ہے، مگر درحقیقت ایسا نہیں، بلکہ یہ اس کی محدود سوچ ہے، جو اس نے انیسویں صدی کے دوران ان الفاظ میں ظاہر کی۔ ہمارے نزدیک مذہب ایک جدا چیز ہے جس میں اخلاقیات کی جذبات سے وابستگی نہیں ہے۔

اخلاقیات کا یہ اصول ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ انسانی معاشرہ میں کس

Marfat.com

طرح ارتقائی منازل طے کی جائیں۔ اس لئے اچھے سے اچھے آئیڈیل تلاش کرنے کی ضرورت ہے، مگر جیساکہ ارسطو نے کہا آئیڈیل ذہنی نہیں بلکہ عملی آئیڈیل۔ کسی منزل اور مقصد کو حاصل کرنے سے قبل آپ کو اس بات کا تعین کرنا پڑے گا کہ آپ کو کونسی فضیلت اور آئیڈیل مطلوب ہے۔ انسانی زندگی میں اچھے سے اچھا جو آئیڈیل ہوسکتا ہے، مذہب اس کی طرف آپ کی رہنمائی کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر مذہب آپ کو بتاتا ہے کہ کس راستہ پر چلنا ہے اور کس راستہ سے گریز کرنا ہے اور یہ کہ آپ کی منزل کیا ہے؟ جبکہ اخلاقیات اس منزل پر چلنے کا طریقہ بتاتی ہے۔ اگر آپ کے چلنے کا انداز بہت خوبصورت ہو، لیکن آپ کے سامنے کوئی منزل متعین نہیں یا آپ کو اپنی حقیقی منزل کا علم نہیں تو آپ کا اچھی طرح چلنا بھی بے سود ثابت ہوگا۔ اس لئے سب سے پہلے آپ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ آپ کس طرف جارہے ہیں؟ مذہب آپ کو دوسرے اطراف اور طریقے بھی بتاتا ہے۔ مثلاً سچائی، خوبصورتی اور اخلاق عالیہ کی دوسری چیزیں۔

اتھیکس کسی چیز کی عملی حالت اور روش کا نام ہے۔ اس لئے آپ کو سچائی کی تلاش کرنی ہے، آئیڈیل کی تلاش مسلسل جاری رکھنی چاہئیے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ خوبصورتی کا بھی آئیڈیل ہوتا ہے اور فرد کی زندگی کی دیگر بہت سی باتوں کے بارے میں بھی سوچنا چاہئے۔ اسی وجہ سے میں نے کہا کہ لفظ "خلق" زیادہ وسیع معنوں کا حامل ہے۔ بالفاظ دیگر اخلاق انسانی فطرت کی کنجی ہے۔ انسانی فطرت، طبیعت، اس کی پسند اور ناپسند سب اس میں شامل ہیں۔ آپ اخلاقی طور جتنے اچھے اور عمدہ ہوں گے، اتنا ہی اس بات کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ انسانی زندگی میں آپ نے ارتقاء کی کتنی منزلیں طے کی ہیں۔

ڈاکٹر ہالیپوتہ صاحب نے آپ کو بتایا کہ انسانی نسلیں ترقی پذیر اور زوال پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات آدمی اتنی بلندی پر پہنچ جاتا ہے کہ وہاں اس

Marfat.com

کے باپ دادا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اور بعض اوقات وہ اتنا نیچے گر جاتا ہے کہ اس سے پست سطح اور درجہ ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن مجید نے اس بات کو نہایت حسین پیرایہ میں بیان فرمایا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ. (ترجمہ) بے شک ہم نے انسان کو بہترین حالت میں پیدا کیا اور پھر اسے بدترین حالت کی طرف لوٹا دیا، یہاں تک کہ حیوانوں سے بھی بدتر مقام اسفل سافلین تک پہنچا دیا۔ چنانچہ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو بلند سے بلند تر مقامات حاصل کرتے ہیں، ان کا اخلاق و کردار ارتقاء کی منازل طے کرتا ہوا اپنی منزل مقصود کی طرف مسلسل بڑھتا رہتا ہے۔ یہی واحد معیار ہے اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے کہ کوئی اور معیار اور کسوٹی ممکن ہی نہیں ہے۔ یونانیوں میں شجاعت اور بہادری کی خصوصیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ بعد میں عیسائیت کا ظہور ہوا، انھوں نے اخبات یعنی عاجزی اور تواضع کا جوہر اپنایا، یہاں تک کہ قرآن نے بھی ان کی عاجزی کی صفت کی تعریف کی۔ نہ صرف اتنا بلکہ قرآن نے اعلان کیا کہ: وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ (الحج پ۱۷) (ترجمہ) تواضع اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ (ترجمہ) جو اللہ کیلئے تواضع اور عاجزی اختیار کرے گا، اللہ اسے سربلند کرے گا۔

ڈاکٹر ھالیپوٹہ صاحب نے آپ کو بتایا کہ شاہ ولی اللہ نے بتایا ہے کہ شجاعت کے معنیٰ صرف بہادری کے نہیں، اس کے صرف معنیٰ یہ نہیں کہ انسان بس ڈنڈا لیکر دوسروں کے پیچھے پڑے یا ان پر مسلط ہو جائے۔ اس کے معنیٰ اس سے زیادہ بلند ہیں۔ حیوان میں بہادری تو ہو سکتی ہے، لیکن انسانی شجاعت میں حیوانیت نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ انسان کی شجاعت اعلیٰ فضیلت اور درجہ کی حامل ہے۔

Marfat.com

انسانی اخلاق کے زمرے میں شجاعت سے بڑھ کر قرآن مجید جس چیز کو بیان کرتا ہے، وہ ہے احسان۔ شاہ ولی اللہ بھی یہی بیان کرتے ہیں۔ احسان کی معنیٰ ہیں، بغیر کسی معاوضے، صلے، ستائش اور تعریف کے، اللہ کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، یہاں تک کہ اس سلسلے میں یہ بھی نہیں سوچنا چاہئے کہ کسی کے ساتھ حسن سلوک کیوں کیا جائے۔ انسان کے وجدان کے اندر یہ چیز خود بخود موجود ہونی چاہئے کہ وہ مخلوق خدا کے ساتھ اچھا سلوک کرے، ایسے ہی آدمی کو "محسن" کہا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ (ترجمہ) احسان کرنے والوں کو خوشخبری دے۔

یوں اخلاقیات میں انبیاء کرام کے اعلیٰ اوصاف، نیکی و تقویٰ، پرہیزگاری، شجاعت، سخاوت اور یونانیوں کے چار بنیادی فضائل، احسان، اخبات، اور دوسری سیکڑوں خصوصیات مجتمع ہوجاتی ہیں۔ اخلاقیاتی قانون کے مطابق ابرار کو پتہ نہیں ہوتا کہ یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے؟ ابرار نیکی کے اس درجہ پر فائز ہوتے ہیں، جس پر پہنچنے کے لئے عام مسلمان تمنا کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں: وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (ترجمہ) اور ہمیں ابرار یعنی نیکوکاروں کے ساتھ موت دے۔ الغرض مسلمانوں کی اخلاقیات میں ابرار کا درجہ بہت بلند ہے۔

پیغمبر اسلام کا فرمان مبارک ہے کہ: حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ (ترجمہ) ابرار کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مقربینِ بارگاہ الٰہی کا اخلاق ابرار سے بہت اونچا ہوتا ہے۔ اس پوری بحث سے معلوم ہوا کہ اسلام نے مسلمانوں کی اخلاقیات کا جو معیار تشکیل دیا ہے، وہ مختلف سطحوں پر مختلف ہے۔ انسان جوں جوں اخلاقی ارتقاء کی منازل طے کرتا جائے گا، اتنا ہی اس کا درجہ بلند ہوتا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (ترجمہ) میری بعثت کا مقصد انسانی اخلاق

Marfat.com

کی تکمیل ہے۔ آپ اس حقیقت کو بھی جانتے ہیں کہ پوری کائنات میں نبی اکرم ﷺ سے بڑھ کر کسی کا مقام اور مرتبہ نہیں اور قرآن مجید نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کے بارے میں اس طرح گواہی دی ہے: وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (ترجمہ) اے نبی! ﷺ آپ خلق عظیم کے حامل ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کے مذکورہ بالا فرمان مبارک اور آپ کے اخلاق حسنہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کی روشنی میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اسلام میں اخلاقیات کا کیا درجہ ہے۔

اس موقعہ پر یہ حقیقت ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ اسلامی اخلاق دو اصولوں سے مرکب ہونے کے بعد مکمل ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (ترجمہ) اعمال یعنی اخلاق کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ دوسرا یہ حکم دیا گیا کہ: تم اپنے اخلاق کو اچھے سے اچھا، خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرو اور یہ بات واضح ہے کہ اسلام میں احسان کا مقام تمام اعمال واخلاق سے ارفع و اعلیٰ ہے، جس سے بلند درجہ اور مقام کوئی نہیں ہوسکتا۔

اس مناسبت سے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان یاد آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی نے ایک بزرگ سے کہا کہ فلاں درویش کہتا ہے کہ مجھے استغفار کی کوئی ضرورت نہیں، میں خود حق ہوں، جبکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے کہ میں ہر روز ساٹھ بار اور دوسری حدیث کے مطابق ایک سو بار استغفار کرتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ آپ ہر روز ہر منٹ میں کیا قصور کرتے تھے، جس کی وجہ سے استغفار کرتے تھے؟ بزرگ نے جواب دیا کہ انسان مسلسل ارتقاء کرتا رہتا ہے اور جب وہ ایک درجہ طے کرتے ہوئے اوپر کے درجہ پر پہنچتا ہے تو محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس سے پہلے میں نسبتاً نچلی سطح پر تھا، چنانچہ ڈرنے لگتا ہے اور اللہ سے معافی طلب کرتا ہے۔ پس یہ استغفار دراصل

کم درجے سے بلند درجہ پر فائز ہونے کے نتیجہ میں ہوتی ہے، جب بندہ کہنے لگتا ہے کہ یا اللہ! مجھے معاف فرما، کیونکہ پہلے میرا عمل حیوانوں کا ساتھا، حالانکہ اس کا عمل حیوانیت کی سطح سے ہزارہا درجے بلند ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی اخلاقیات کی یہ خصوصیت ہے کہ اسلام میں اخلاقی قواعد و ضوابط جمود کا شکار نہیں، بلکہ وہ مسلسل ارتقاء پذیر ہیں، جو کام ایک بچے کے لئے اچھا ہوتا ہے وہ بڑے کے لئے اچھا نہیں ہوتا۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ روزہ عام آدمی کیلئے نیکی کا کام ہے، مگر خاص اشخاص کے لئے اس میں فقط بھوکا رہنا ہے۔ امام غزالی کی نگاہ میں خاص آدمی کا روزہ ایک عام مولوی کی سوچ سے ماورا چیز ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ روزے کی معنیٰ ہر برائی سے بچنا ہے۔ یعنی غلط سوچ، غلط نظریے، غلط نظر اور دیگر تمام برائیوں سے اپنے آپ کو بچانے کا نام روزہ ہے۔ روزہ صرف کھانا نہ کھانے کا نام نہیں۔ یوں امام غزالی کے روزہ اور عام لوگوں کے روزے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بالکل اسی طرح عام لوگوں اور خاص لوگوں کی گفتگو، چال چلن، رشتے ناتے، سماجی تعلقات، نماز روزے اور روحانی معاملات میں بڑا فرق ہے۔

(نوٹ: تقریر کا دوسرا حصہ یا تو رکارڈ نہ ہوسکا، یا ضائع ہوگیا ہے۔ انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم تقریر کا چوتھائی حصہ رہ گیا ہے)

Marfat.com

# کردار

(علامہ صاحب نے یہ لیکچر جولائی ۱-۱۹۲۹ع کو تھیافاسیکل ہال کراچی میں دیااور سب سے پہلے "سندھ ھیرالڈ" رسالے کے 'P۲ophet Issue' میں ۱۸اگست ۱۹۲۹ع کوشائع ہوا)

خواتین و حضرات! یا جس طرح مجھے زیادہ موزون لگتا ہے، اب آپ کو سچ سے پیار کرنے والے اور طالب خدا کہہ کر مخاطب کروں - حقیقت یہ ہے کہ آپ مرد ہوں یاعورت، لیکن اس کے باوجود بہت اوپر جاسکتے ہیں، کیونکہ ان بلندیوں کی کوئی حد نہیں، جہاں انسان کی رسائی ممکن ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ ہمارے فاضل چیرمین نے اس لیکچر کا تعارف مبالغہ آمیز انداز میں کرایا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ مجھ جیسے غریب آدمی سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ مجھے عالم ہونے کی دعوی کم ہے، بایں ہمہ جو تھوڑا بہت علم ہے، آج اس کا ظہار کرنا چاہوں گا۔ یہ میرے ذاتی غور و فکر کا نتیجہ ہے اور یہ کئی برسوں کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔ دو تین دن کی بات ہے جب ہمارے ایک پڑھے لکھے دوست نے کہاکہ "ہمیں مذہب کی ضرورت نہیں، ہم محض کردار چاہتے ہیں۔"

میں اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا۔ حالانکہ الفاظ کا انتخاب صحیح نہ تھا۔ علاوہ ازیں ان الفاظ میں جو کھلا تضاد تھا، وہ مجھے پسند نہ آیا۔ بہر حال اس سے اس انتشار اور بحرانی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو دو اہم معاملات یعنی مذہب اور اخلاق کے بارے میں پوری دنیا، بالخصوص ہندستان میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مجھے اسی روز ایک اور جگہ خطاب کرنے کی دعوت دی گئی تو میں نے بے اختیار گفتگو کے لئے "کردار" کے موضوع کا انتخاب کیا۔

Marfat.com

عام نقطہ نگاہ کے مطابق "کردار" ایسے اخلاقی اوصاف کا مجموعہ ہے، جو انسان ذات میں مشترکہ ہیں، مگر میں یہاں اس حوالے سے بات نہیں کروں گا۔ جو حضرات کردار کے بارے میں اس لحاظ سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں، مناسب اور بہتر ہوگا کہ وہ اپنی رہنمائی کے لئے اس موضوع پر کسی جانے پہچانے مصنف کی کتاب کا مطالعہ کریں۔ اس لئے آپ سے گزارش ہے کہ آج تھوڑی دیر کے لئے اخلاقیات کے بارے میں اپنی آراء محفوظ رکھیں اور مسئلے کو جوں کا توں دیکھنے کی کوشش کریں۔

چونکہ میں لفظ کردار (Character) کے بارے میں بات کررہا ہوں، اس لئے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ اس لفظ کے وہ لغوی معانی بھی بیان کرتا چلوں جو ہمیں "ویبسٹر" کی ڈکشنری میں ملتے ہیں۔ اس میں ایک معنیٰ یہ دئے گئے ہیں کہ کسی چیز کی ایسی علامت یا پہچان، جو اس کی کسی خاص ماہیت و حقیقت کی طرف رہنمائی کرے، جس کے ذریعے اس کی اصلیت، ماہیت اور ذاتی خدوخال سے واقفیت ہوسکے۔ یعنی ایسی خصوصیت یا خوبی جس کی وجہ سے کوئی چیز دوسرے سے ممتاز و نمایاں ہوتی ہو۔ دوسرے معنیٰ یہ دیے گئے ہیں: ایسی صفت یا خوبی جو کسی فرد یا گروہ میں پائی جاتی ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ کسی فرد کے کردار سے مطلب وہ خاصیتیں ہرگز نہیں کہ جن میں عام طور پر وہ دوسروں کے ساتھ شریک ہوتا ہے، بلکہ اس سے مقصود وہ امتیازی اوصاف اور خصائص ہیں، جن کی وجہ سے وہ شخص دیگر افراد سے جدا اور منفرد نظر آتا ہے۔ یہاں میں اس کی چند ایک مثالیں پیش کرتا ہوں:

نمک کی یہ خاصیت ہے کہ وہ نمکین ہوتا ہے اور اشیاء کی حفاظت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ چینی میٹھی ہوتی ہے، ریشم نرم ہوتا ہے اور کانٹا چبھنے والا ہوتا ہے۔

Marfat.com

ان مثالوں سے آپ پر واضح ہوگیا ہوگا کہ جہاں تک ان اشیاء کی ذاتی خوبیوں کا تعلق ہے، باہم تقابل نہیں ہوسکتا، ہر چیز دوسرے سے الگ ہے اور ہر ایک کی تاثیر اور عمل جداگانہ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر خدانخواستہ ان میں سے وہ خاص خوبی اور صفت ختم ہوجائے، جس کی بدولت اس کی پہچان ہوتی ہے، تو کہا جائے گا کہ اب اس کا کردار ختم ہوگیا ہے۔

یہاں پہنچنے کے بعد میں آپ کو تھوڑا آگے اس مقام پر لے جانا چاہتا ہوں، جہاں وہ انفرادیت ابھی غیر ترقی یافتہ معلوم ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کو طبعیات کی پیچیدہ راہوں میں لیے پھروں، خواہ میرے اندر یہ صلاحیت موجود ہو۔ مین ایک حقیقت آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں، جسے طبعیات کے سب ماہر فلسفی تسلیم کرچکے ہیں، وہ یہ کہ وہ مادہ جسے ہم ٹھوس خیال کرتے ہیں اور جو ماضی کے فلسفیوں کے ہاں ٹھوس چیز تصور کیا جاتا تھا، اب وہ کم ہوکر اتنا ہلکا ثابت ہوگیا ہے کہ اس کی حیثیت بادل اور ہوا جیسی بھی نہیں رہی۔ اسی طرح خفیف سے خفیف گیس ہاڈروجن جو الیکٹرانوں سے مرکب ہے۔ اس لحاظ سے اس کائنات کی مادی بنیاد اور اساس ہمیں بتاتی ہے کہ اسے قدیم اصطلاح کے مطابق مادی یا طبعی ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔

الیکٹران کی بنیادی خاصیت مستقل متحرک رہنا ہے۔ خواہ اسے آپ فعلی توانائی کہیں، مخفی توانائی کا نام دیں یا اور کوئی نام دیں۔ یہاں میرا مقصد الفاظ میں الجھنا نہیں۔ مگر ایک بات طے شدہ ہے کہ الیکٹران مادہ ہرگز نہیں، جیساکہ مادہ کے بارے میں ہمارا عام تصور ہے۔

میں ایک بار پھر یہ بات دہراؤں گا کہ موجودہ دور کے سائنسدانوں کو پختہ یقین ہے کہ جس چیز کو مادہ کہا جاتا تھا، وہ دراصل ایک بڑے بنیادی عنصر کی شکل اور صورت تھی۔ اس لئے یہاں یہ مفروضہ نہایت آسانی سے اختیار کیا جاسکتا

Marfat.com

ہے کہ اس آفاقی عنصر کے لازماً کچھ خصائص ہوں گے۔ ان میں سے ایک خاصیت جس کا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اس کا مستقل متحرک ہونا اس کی ذاتی خاصیت ہے۔

یہاں ہم اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتے کہ ان عناصر کی ابتدائی شکل کیا تھی، جن میں الیکٹران اور گیسز شامل ہیں؟ اگرچہ آپ جانتے ہیں کہ ان کے بھی اپنے خصائص اور عناصر ترکیبی ہیں اور یہ اپنی مخصوص روش کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں، بلکہ ان میں سے کوئی بھی دو عناصر ایک جیسے نہیں۔ اس بات کو یہاں چھوڑ کر اب ہم جمادات کی دنیا میں آتے ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک قسم کے پتھر کا مادہ دوسرے قسم کے پتھر کے مادہ سے معمولی اور برائے نام مختلف ہوتا ہے۔ قدرے ادھر ادھر تلاش اور غور وفکر کے بعد ہمیں بعض ایسی دھاتیں اور قیمتی پتھر مل جاتے ہیں، جو اپنی منفرد خاصیت کی وجہ سے دوسروں سے نمایاں اور ممتاز ہوتے ہیں۔ اس طرح ہمیں ایک قسم کی پیچیدگی، انفرادیت کی بڑھتی ہوئی قوت اور زور محسوس ہونے لگتا ہے۔

معدنیات کی دنیا کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ باہر سے بالکل ٹھوس محسوس ہوتی ہیں اور ان میں اندرونی عمل اور تغیر ہوتا رہتا ہے۔ کسی حد تک یہ بات نباتات اور سبزیوں پر بھی لاگو ہے۔ مثلاً آپ سب جانتے ہیں کہ درخت حرکت نہیں کرتے، بلکہ وہ جس جگہ پر ہوتے ہیں، وہاں زمین میں اپنی جڑیں گہری اور مضبوط کرتے جاتے ہیں۔ درختوں کی بھی بہت سی اقسام ہیں یہاں تک کہ ہر قسم کا اپنا اپنا جداگانہ رنگ وبو اور شکل وصورت ہوتی ہے، مگر ان میں اپنی نوعیت کی کچھ بنیادی خاصیتیں بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً غیر متحرک ہونے میں بعض چیزیں اپنی اصلیت اور مرکز سے باہر جاتی ہیں۔ چنانچہ بعض کیڑے اور جراثیم جو حرکت کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں، وہ گویا نفرت اور حقارت کی

Marfat.com

علامت بن جاتے ہیں اور بعد میں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی اصلیت کھو بیٹھے ہیں۔

درختوں کی دنیا کو چھوڑنے سے قبل میں یہاں دو قسم کے ہندستانی درختوں کا بیان کرتا ہوں، جو برسوں سے میری دلچسپی کا باعث ہیں، وہ ہیں بڑ، پام اور کھجور کے درخت۔ بڑ کی خاصیت یہ ہے کہ اس کی نئی پیدا شدہ جڑیں زمین کی طرف بڑھنا شروع کرتی ہیں اور اپنے لئے اسی درخت کی جڑ کے قریب زمین میں جگہ پیدا کرتی ہیں۔ اس طرح اس اصلی درخت کے قریب اگ کر اس کی جڑوں کو مضبوط و پائدار کرتی ہیں۔ میرے لئے یہ بات نہایت دلچسپی کا باعث رہی ہے کہ جس زمین میں یہ درخت پیدا ہوا ہے، اسی میں انسان ذات کے لئے "مشترکہ خاندان" کا نظام وجود میں لایا گیا۔

دوسری مثال کھجور یا پام کے درخت کی ہے، جس کا میں نے اوپر نام لیا ہے۔ اس کی خاصیتیں بڑ سے بالکل جداگانہ ہیں۔ جوں جوں یہ درخت بڑھتا جاتا ہے، گویا زمین سے اپنے تعلقات ختم کرتا جاتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ زمین میں اس کی جڑیں کتنی گہری ہیں، مگر زمین کی سطح کے قریب وہ اپنی کوئی شاخ نہیں چھوڑتا۔ یہ ہمیشہ سیدھا بڑھتا ہے، یہاں تک کہ اس کی شاخوں میں جو چوٹیاں ہوتی ہیں، ان کا بھی منہ اوپر کو ہوتا ہے، اگرچہ وہاں اس میں بہت پھل لگتا ہے۔ ان دونوں بڑے درختوں کے بارے میں اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، مگر ہمارے پاس اتنا وقت نہیں۔ اس وجہ سے اب ہم حیوانوں کی دنیا کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلی بات جس کے ذریعے ہم نباتات اور حیوانوں میں فرق کر سکتے ہیں اور جو نہایت مؤثر انداز میں ہم پر اثر انداز ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ نباتات کے مقابلے میں حیوانات ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرنے کی خاصیت رکھتے ہیں۔ خواہ بلند پروازی کے ذریعے یا تیز رفتاری کے ذریعے۔

Marfat.com

جس طرح عقاب اونچا اڑتا ہے اور ہرن تیز چلتا ہے۔ یہ قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ جو چیز حرکت نہیں کرتی، اسے آنکھیں بھی نہیں دی گئیں۔ جبکہ دوسروں کے مقابلے میں وہ دوڑنے میں تیز ہوتا ہے، اس کی آنکھیں بھی تیز نگاہ والی ہوتی ہیں۔ حیوانوں میں شُشوندر اس کا بین ثبوت ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے اس موضوع کو یہیں چھوڑ کر ہم دوسری طرف نظر دوڑاتے ہیں۔ درحقیقت یہی حالت نہ صرف مادی دنیا سے لاگو ہے، بلکہ فکری اور روحانی دنیا میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ گیان یا سوچ ایک قسم کی حرکت پذیری ہے تو دھیان ایک قسم کا روحانی سکوت ہے، ان میں بھی آخر کار فکری اور روحانی نظر پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کے تمام قابل ذکر فلسفی فکر کے ان ابتدائی حالات و مراحل سے گزرے ہیں اور سارے پیغمبر پہلے روحانی مدارج اور حالات سے گزرے ہیں، جن میں زردشت اور گوتم بدھ بھی شامل ہیں تو حضرت عیسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی۔ جن کو تفکر اور ریاضت کی منازل و مراحل سے گزرنا پڑا۔ اس کے بعد ان کو نور بصیرت حاصل ہوا اور انہوں نے تبلیغ کرنا شروع کر دی۔

الحاصل ہم نے دیکھا کہ بڑ اور پام کے درختوں میں بعض خصائص ایسے ہیں جو انسانی خصائص سے ملتے جلتے ہیں۔ بالکل اسی طرح حیوانوں میں حرکت کرنے کی خاصیت ہے جو انسانوں میں بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسے ہم انسانی کردار کے اجزاء و عناصر قرار نہیں دیتے۔ ایک اعتبار سے طبعی یا جسمانی خاصیتیں کردار کے دائرے میں نہیں آتیں۔ البتہ چلتے چلتے اس بات کی طرف اشارہ کرنا موزوں معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں ایک طبعی خاصیت کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور وہ ہے رنگ۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یونانی تہذیب کے عروج کے وقت وحشی (Berbarian) کا لفظ نفرت کے لئے استعمال ہوتا تھا، اگرچہ اس

Marfat.com

کے لفظی معنیٰ غیر یونانی تھے۔ لیکن بہر حال اس کا مطلب کند ذہن انسان تھا۔ یہی معنیٰ افلاطون کی تحریر میں ملتی ہے۔ اسلامی تہذیب کے زمانے میں وحشی کا مطلب خدا تعالیٰ کی وحدانیت سے روگردانی کرنے والے کے طور پر مشہور ہوا۔ لیکن موجودہ دور میں مہذب کا مطلب گورے رنگ کے انسان اور غیر مہذب کا مطلب کالے اور رنگدار لوگ لئے جاتے ہیں۔

طبعی حالات کو ایک طرف رکھ کر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک پرندہ میں اپنے بچے پر جان قربان کرنے کا جو جذبہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے، یہی جذبہ انسانوں میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ اسی طرح کتے میں وفاداری کا جذبہ، شیر میں حکمرانی کرنے کی قوت، ہمیں انسانی خاصیتوں کی یاد دلاتی ہے۔ مگر ان سارے حقائق کے باوجود ہم لوگ ان کو "جبلی خصائص" قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں۔ اگرچہ ہماری رائے ہے کہ بنی نوع انسان میں اور بھی خصائص ایسے ہیں، جو فی الواقع صرف انسانوں کا ہی خاصہ ہیں اور جس کی بنا پر ہم نباتات اور دیگر مخلوقات سے الگ ہیں۔ اس خاصیت کو ہم اپنی "ذات کا شعور" کہتے ہیں اور اس کے ساتھ تصور کی خاصیت بھی ہے، جس کے ذریعے "انا" کی خاصیت سے آشنائی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان میں جداگانہ تشخص کا احساس ابھرنے لگتا ہے اور اس کے بعد ہم ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کر کے سمجھ سکتے ہیں۔ آگے چل کر ہم ان میں مشابہتوں اور غیر مشابہتوں کی تلاش کرنے لگتے ہیں، جس کے بعد کوئی نسبت تلاش کر کے اس کی صف بندی شروع کرتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جائے تو بجا ہوگا کہ ہم عقل کو استعمال کر کے تجزیہ اور ترکیب کے تمام مراحل طے کرتے ہیں۔ یہاں پہنچنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہے وہ خاصیت یا جبلت جو انسان ذات کے ساتھ مخصوص ہے اور جس کی بنا پر وہ باقی دوسری دنیا سے ممتاز اور جدا نظر آتا ہے۔

Marfat.com

آگے بڑھنے سے قبل مجھے آپ سے یہ استدعا کرنی ہے کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھیں کہ "کل" کی خاصیتوں میں کس قدر ترقی ہوئی ہے؟ اس سلسلے میں ایک بات جو نہایت واضح ہے وہ ہے بڑھتا ہوا انفرادی شعور۔ اس میں اگرچہ بہت سی پیچیدگیاں بھی رونما ہوئیں، جو وضاحت طلب تھیں، مگر ان کا مکمل اظہار بھی اسی صورت میں ممکن تھا۔ بہرحال یہ سب باتیں مل کر ایک خاصیت کا سبب بنی ہیں اور وہ ہے چیز کا خارجی وجود یا ظاہری صورت۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں قدیم عنصر کی ظاہری حرکت اب اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔ مگر اس سے بڑھکر اس نئی تحریک کا وجود ہے، جس کی وجہ سے اس کا قدیم چیز سے تعلق ختم ہوگیا ہے۔ پہلے مرحلے پر "میں" اور "تم" ایک دوسرے سے بالکل جدا معلوم ہوتے ہیں، مگر بعد میں نہ صرف "میں" کا "میں" سے رابطہ بحال ہوتا ہے، بلکہ وہ پوری خارجی دنیا کو اپنے اندر تلاش کرنے لگتا ہے۔ اس کی مثال کچھ اس طرح ہے:

میں خود سے باہر جب کسی چیز کا سوچتا ہوں اور اسے کوئی نام دیتا ہوں تو گویا وہ سب کچھ میرا حصہ ہے۔ یہ خارجی دنیا کی نشونما نہیں کہی جائے گی، بلکہ اشیا کے خارجی مناظر کی طرف ایک قسم کی حرکت پذیری ہے، جسے ہم "اندرونی تحریک" کا نام دے سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان خارجی دنیا کے بارے میں ابتدا اپنی اندرونی دنیا کے عکس سے کرتا ہے اور پھر ذہنی طور پر آگے بڑھنا شروع کرتا ہے۔ یہیں خارجی و داخلی یا ظاہری و باطنی سنگم کا احساس ہونے لگتا ہے، اس کے بعد جوں جوں وہ آگے بڑھتا ہے، اسے روحانی دنیا کا نام دیتا ہے۔

الغرض انفرادیت کا احساس جو سونگھنے کے احساس سے شروع ہوتا ہے، وہ سننے اور بالخصوص دیکھنے کے ذریعے مزید مستحکم ہوکر ادراک و شعور کی شکل لیتا ہے۔ یہیں پر ایک قسم کا جزو اس چیز کے وجود سے بالکل جدا پیدا ہوتا ہے۔ اس

Marfat.com

لئے کسی چیز کا تصور اگرچہ خارجی دنیا سے تعلق نہیں رکھتا، مگر اس کا جداگانہ وجود ضروری ہے اور یہیں سے عقلی دنیا کی ابتدا ہوتی ہے، بالفاظ دیگر داخلی تحریک کا آغاز ہوتا ہے، جو اس کے وجود کا ثبوت ہے۔ اس سلسلے میں مزید داخلی سفر کو ہم "روحانی سفر" کہتے ہیں۔

ایک لحاظ سے یہ ہے وجود کا پورا خاندان! جسے ہم نے اپنے تجزیے کے مطابق تین مختلف مادی، فکری اور روحانی سطحوں میں تقسیم کیا ہے، ان تینوں کے ساتھ انسانی وجود قائم ہے اور انسانوں کی خاصیتیں بھی انھیں سے جنم لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان تینوں سطحوں کا ایک دوسرے کے ساتھ عمل اور رد عمل کا سلسلہ بھی برابر جاری رہتا ہے۔ یوں ان تینوں سطحوں میں معمولی تبدیلی کے ذریعے مختلف قسم کے انسان وجود میں آتے ہیں۔ کسی ایک عنصر میں کم و بیش تبدیلی سے بالکل مختلف نوعیت کے انسان وجود پذیر ہوتے ہیں۔ میں وضاحت کے لئے ایک مثال پیش کرتا ہوں:

نباتات یا جاندار اشیاء میں کسی خواہش کا پیدا ہونا اور اس کی تکمیل کا عمل، دوسرے الفاظ میں کسی خارجی چیز کے بارے میں جاندار کا اپنا رد عمل، ہر حال میں انسانوں جیسا ہی ہوتا ہے۔ مثلاً پکا ہوا پھل جس طرح ایک پرندہ میں ترغیب و تحریص پیدا کرتا ہے اور وہ آکر اسے کھاتا ہے، یہی حالت انسان کی بھی ہے، جو اس پھل کو توڑ کر منہ سے چکھ کر کھاتا ہے۔ اسی طرح جنس کی بقا کے سلسلے میں نر اور مادہ کی موجودگی، فریقین میں محبت کا سبب بنتا ہے اور اس کے نتیجے میں ان سے ایک خاص فعل سرزد ہوتا ہے۔

مگر اس وقت بالکل ایک نئی صورت حال جنم لیتی ہے، جب وہ احساس رد عمل کو ابھارتا ہے اور یہ جسمانی عمل وسیع تر صورت اختیار کرتا ہے یعنی جب وہ خود کو ذہنی و فطری صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ طبعی دنیا کے قاعدے کے مطابق

Marfat.com

ایک فوری طبعی رد عمل سامنے آتا ہے، اور اس رد عمل سے جو اندھی گرمی نکلتی ہے، وہ پہلے شعلے اور بعد میں روشنی کی صورت اختیار کرتی ہے، لیکن اگر عملاً مفید اور فوری طبعی رد عمل وجود میں نہیں آتا تو پھر یہ ایک نئی صورت اختیار کرتا ہے اور اس صورتحال کو ہم اپنی زبان میں "جمالیاتی" کہتے ہیں۔ اس طرح جب ہم ایک تصور سے دوسرے تصور تک پہنچتے ہیں یا جب خارجی دنیا کی اشیاء سے رابطہ پیدا کرنے کی بجائے ہم ان کی تخلیقی اور علامتی حیثیت سے رابطہ قائم کرتے ہیں بلکہ اس سطح پر چھان بین کرتے ہیں اور خارجی دنیا کے ساتھ کچھ زیادہ تعلقات قائم کرنے کی بجائے بعض عمومی نتائج اخذ کرتے ہیں تو پھر ایسی صورتحال کو عقلی صورتحال کہا جاسکتا ہے۔ بعینہ جب مزید غور و فکر کے بعد گہرائیوں میں جاتے ہیں، جہاں ہمیں پہلی ہی نگاہ میں زیادہ گہرائیوں کا انکشاف ہوتا ہے، تو اس صورتحال کو ہم "روحانی سکون" سمجھتے ہیں۔

دوسری طرف اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ فکری قوت اپنے اظہار کے لئے کوئی ایک صورت اختیار نہیں کرتی، بلکہ وہ طبعی دنیا کا رخ اختیار کرتی ہے۔ اور ایک ظاہری عمل کی شکل و صورت اختیار کر لیتی ہے، ایسی صورتحال جب چھوٹے پیمانے پر "عوامی تحریک" کی صورت اختیار کرتی ہے تو اسے قومی سطح کے ساتھ مخصوص کیا جاتا ہے، لیکن روحانی شکل جب خارجی صورت اختیار کرتی ہے تو پھر یقیناً عظیم تر تحریکیں جنم لیتی ہیں۔ دنیا کے سارے بڑے بڑے مذاہب اس طرح کی تحریکوں کی پیداوار ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہ روحانی قوت جو خارجی روپ دھارتی ہے، وہ انسان کی ساری شخصیت کو متاثر کرتی ہے، لیکن اگر اس کے مقابلے میں، اس قوت کا دائرہ کار اتنا وسیع نہیں تو پھر وہ انسانوں پر اثر بھی اتنا ہی کم ڈالتی ہے۔

سردست ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ اس دقیق موضوع پر زیادہ گفتگو

Marfat.com

کی جا سکے۔ یہاں صرف اتنا بتانا کافی ہو گا کہ ایسے افراد جو جمالیاتی، فکری، اور روحانی قوت سے مالامال ہیں، ان کے ارد گرد چھوٹے بڑے گروہ ضرور مجتمع ہوا کرتے ہیں جو بعد میں گروہی، سماجی، قومی، مذہبی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی رہنمائی کے لئے خاص کردار اور جس ماحول میں وہ رہتے ہیں، اس کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ اس لئے دنیا کے جنوب مشرقی حصے کی یہ خاصیت رہی ہے کہ یہاں بڑے بڑے گروہ وجود میں آئے ہیں۔ اس کے بالمقابل شمالی مغربی حصے کی یہ خاصیت رہی ہے کہ وہاں بڑی بڑی قومیں وجود میں آئیں۔ یوں شمال۔ مغرب اور جنوب۔ مشرق [illegible] سائص کے بارے میں ارسطو کا کہنا ہے کہ شمالی علاقوں کے لوگ زندگی کے لئے سخت ترین جدوجہد کرنے کی وجہ سے جنگ جو بن گئے۔ چنانچہ گزشتہ کئی ہزار برس سے ان کا خاص پیشہ حیوانوں کا شکار کرنا اور ایک دوسرے کو قتل کرنا رہا ہے۔ اس کے برعکس جہاں تک جنوب۔ مشرق کا سوال ہے تو وہاں کی صورتحال ایسی نہیں ہے۔ اگرچہ ان علاقوں کے لوگ بھی ان ہی مراحل سے گزر کر آئے ہیں، مگر وہ ان غیر متمدن حالات سے بڑی تیزی سے ترقی کی طرف گامزن ہو گئے۔

یہ بات بھی عیاں ہے کہ مسلسل جنگ و جدال کی بنا پر آدمی کے پاس نہ تو سوچنے اور غور و فکر کرنے کے لئے وقت بچتا ہے اور نہ ہی اسے روحانی منازل و مراحل سے گزرنے کے لئے فرصت ملتی ہے۔ بلکہ ایسی صورتحال میں بنیادی کام یہ رہ جاتا ہے کہ اپنی نسل نو کی بقا و حفاظت کا انتظام کس طرح کیا جائے؟ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ موجودہ زمانے تک قدیم النسل جرمن قوم میں وہ نام زیادہ دلچسپی کا باعث رہے ہیں، جن سے جنگ و جدال کی بو آتی ہو۔ مثلاً گرٹرڈ (Gerturd) کے معنیٰ ہیں محبوب ترین نیزہ، فریڈینڈ کے معنیٰ ہیں لشکر کی راحت۔ اسی طرح یورپ کی انتہائی پرکشش موسیقی کا جو بانی ہے، اس کا نام

Marfat.com

ہے "وولف گانگ" اس لفظ کے معنیٰ ہیں: "بھیڑیے کا راستہ" یہی معنیٰ جرمنی کے عظیم شاعر "گوئٹے" کے بھی ہیں، حالانکہ مشرقی ممالک میں کوئی گنوار بھی یہ نام رکھنا گوارہ نہیں کرتا۔

یہاں شاید آپ یہ سوچیں کہ مختلف قسم کے یہ کردار شروع سے ہی خارجی اثرات سے مبرا رہے ہیں، مگر اس طرح ہم ایک نہایت اہم حقیقت کو نظر انداز کریں گے۔ وہ اہم حقیقت یہ ہے کہ انسان ذات بھی دھرتی کی طرح ایک اکائی یا براعظم ہے جس طرح ہواؤں کا نظام اور اس کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ مسلسل ہواؤں کے چلنے کا سبب اور مقصد یہ ہے کہ زمین کی آبھوا کو معتدل رکھا جاسکے۔ اسی طرح انسانی تاریخ میں بھی جنوب سے شمال کی طرف بڑی بڑی تحریکیں چلتی رہی ہیں، مشرق سے مغرب کی جانب بھی تحریکیں چلی ہیں تاکہ ممکن حد تک حالات کو متوازن رکھا جاسکے۔ اس سلسلے میں ارسطو، ہلاکو، چنگیز خان، قیصر، گوتم بدھ اور حضرت عیسیٰ گویا کہ ایک ہی عمل کی مختلف کڑیاں ہیں۔

اس بات میں کوئی شک شبہ نہیں کہ عیسائیت ایسے لوگوں پر مسلط کی گئی جو اس تحریک کو قبول کرنے کے روادار ہی نہ تھے۔ مثلاً قدیم جرمن قوم (Prussians) پر گیارہویں صدی عیسوی میں عیسائیت بزور شمشیر تھونپی گئی، اسی طرح سوید قوم کے ساتھ بھی ہوا۔ حیرت ہوتی ہے کہ دسویں صدی کے آخر تک انسانی جانوں کی قربانی دی جاتی رہی۔ اگرچہ تین ہزار سال قبل انسانی جان کے نذرانہ کو گھوڑے کی قربانی سے تبدیل کیا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک قربانی کا تعلق ہے تو "پروشیا" (Purusha) کی جگہ "اوسا" (Avsa) نے سنبھالی۔ مگر اسی بات نے یورپی لوگوں کی زندگی میں ایک مصیبت کھڑی کردی، جو ان کے ماحول کو متاثر کرنے کے علاوہ ان میں ردعمل بھی پیدا کر رہی تھی۔ یہ بات اس حقیقت سے بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے ہفتہ کو سات دنوں

Marfat.com

میں تقسیم کیا، جس کے چھ دن وہ اپنے پرانے طریقے کے مطابق گذارتے تھے اور باقی ایک دن (Sabath) کو انہوں نے مقدس قرار دیا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے فن کو بھی دوطرح سے تقسیم کر دیا تھا یعنی مقدس اور غیر مقدس یا دینی اور دنیاوی۔ یہاں تک کہ یہ فرق یورپ کے لافانی شاعروں میں لافانی حیثیت اختیار کر گیا، جن میں ایک طرف اسپینسر اور اس کے بعد آنے والے شعراء شامل ہیں تو دوسری جانب تیئان اور اس کے ہمعصر مصور اور موسیقار شامل ہیں۔

اس بات سے آپ کے اندر یہ احساس ہرگز نہیں ابھرنا چاہئے کہ شمال مغرب کے لوگ آپ کے مقابلے میں بالکل جدا کوئی نرالی مخلوق ہیں۔ کیونکہ آپ مذہب کو نہ صرف باطنی زندگی کے لئے کافی سمجھتے ہیں، بلکہ ظاہری زندگی کے لئے بھی اسے کامل سمجھتے ہیں اور ہمارا یہ رویہ صرف ہفتے کے ایک دن کے لئے نہیں، بلکہ سال کے تمام ایام کے لئے ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو، خوشحالی کے ان دنوں میں وہ اپنی نسل سے کتنا بھی دور ہوں، پھر بھی آپ کے چچازاد بھائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فرانسیسی یا آئرش بہت حد تک ایرانی معلوم ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب زردشت نے یہ اعلان کیا کہ الوہیت کا دیوا آدرش (Deva Ideal) خدا تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ بن چکا ہے اور یہ دیوا اب شیطانی شکل وصورت اختیار کر بیٹھا ہے، تو اس وقت ایک بہت بڑی نقل مکانی کی تحریک اپنے خداؤں کی حفاظت کے لئے شروع ہوئی (اگرچہ بعد میں بھی اس طرح کی تحریکیں چلتی رہیں) یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح یورپی فرقے "منی فلاور" کے لوگ اپنے عقیدے کی حفاظت کے لئے جہازوں کے ذریعے امریکہ چلے گئے تھے۔ مگر چونکہ ان کو اپنے وطن سے محبت بھی تھی، اس وجہ سے انہوں نے وہاں "یارک" کی بجائے "نیویارک" قائم کیا۔ اسی طرح پارسیوں نے جاکر "پیرس" بنایا اور ایرانیوں نے وہاں ایران کی بجائے ایرن (Erin) قائم کیا۔

Marfat.com

اس کے باوجود ان کا کام بہت مشکل تھا، کیونکہ سخت سردی کے ماحول میں ان کے لئے زندگی کو برقرار رکھنا محال تھا۔ ان کے مقابلے میں ان کے وہ کزن جو ہندوستان کی سرزمین میں جاکر آباد ہوئے، ان کا کام بہت آسان تھا، کیونکہ ان کے پاس بہترین جنگلات اور کھیت تھے۔ جہاں سے وہ آسانی کے ساتھ خوراک اور گرمی و توانائی حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کو کافی آسانیان بھی حاصل تھیں۔ اس وجہ سے وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ دیواس سے اسوارس، ترمورتی سے برہما اور برہما سے اوم تک پہنچ گئے۔ لیکن مغربی یورپ میں دیو (Dieo) آج تک تقریباً وہی ہے۔ وہاں زیادہ سے زیادہ جو روحانی وجود تھا، وہ بھی گھوم پھر کر گوشت پوست کا انسان اللہ کا بیٹا قرار پایا۔

یوں عیسائیوں کی شدت کی وجہ سے جو بھی نتائج و عواقب پیدا ہوئے، وہ سب زیادہ تر منفی قوتوں کا نتیجہ تھے، جن کا مقصد پرانی سرگرمیوں کو ختم کرنا بھی تھا۔ عیسائیوں کا یہ اثر ردعمل کی صورت میں ایک ہزار برس تک قائم رہا۔ ادھر مشرق میں ایک نئی تحریک برپا ہوئی، جو مغرب کی طرف بڑھنے لگی، جس کی وجہ سے وہاں مثبت سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ یورپ کے موجودہ سارے ادب پر اس کا احسان ہے۔ اس نئی بیداری کی لہر نے عیسائیوں کے تباہ کن اثرات کے خلاف پورے یورپ میں ہمہ گیر تحریک شروع کردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپی اقوام نے اپنا تعلق ماضی سے توڑکر وہاں سے اپنی زندگی کا سفر شروع کیا، جہاں وہ رک گئے تھے۔ اس نئے ردعمل کی وجہ سے یہ فرق پڑا کہ پرانی سرگرمیوں میں اب اصلاحات کا عمل شروع ہوگیا۔ جس کی بنا پر فکری ترقی ممکن ہوئی۔

مثلاً انگلستان میں اس فکری ترقی نے خارجی شکل میں ایک ایسے عمل کی صورت اختیار کی، جس نے بعد کے ادوار میں ایک باقاعدہ علمی شکل اختیار کرلی، جسے ہم "سیاست" کہتے ہیں۔ نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں ہم "سیاست" کے وہ معنیٰ

Marfat.com

بھی بیان کر دیں جو بیسویں صدی عیسوی کے لغت کے کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ پالٹک (Poltic) یعنی اسم کی صورت میں اس کے معنیٰ ہیں پرواہ نہ کرنے والا یا مذہب کا موسمی پیروکار۔ صفت کے لحاظ سے اس کے معنیٰ ہیں اصولوں کے مقابلے میں مروج نظام اور تنظیم کا حامی یا دوسرے الفاظ میں چالاک، ہوشیار، دانا، عیار، شاطر و مکار۔ نیز دانشمند، تیز فہم، کام سے کام رکھنے والا، خواہ صحیح ہو یا غلط۔

حیرت کی بات ہے کہ شیکسپیئر جیسا آدمی بھی ان باتوں کا شکار نظر آتا ہے۔ وہ بھی ایک لحاظ سے سیاست باز ہونے کے ساتھ ساتھ قومیت کی بات کرتا ہے۔ اس کے باوجود الہام و یقین کے مراحل کے وقت وہ خود کو ان باتوں سے آزاد محسوس کرتا ہے، مگر یہ اس کی معمول کی سطح نہیں ہے۔ اس کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ جب وہ اس لفظ (Politic) کا استعمال کرتا ہے، تو وہ کہتا ہے کہ "دوست سے نرمی سے اور دشمن کے ساتھ ٹھیک ٹھاک روش اختیار کرنی چاہئے۔" اس قدر وسیع المشرب ہونے کے باوجود اس کا ذہن جون آف آرک (Joan of Arc) کو دشمن سمجھتا ہے۔ اگرچہ اس بچاری کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے انگریز قوم کے مفادات کی مخالفت کی تھی۔ شیکسپیئر کے مقابلے میں شیلر (Schiller) اور "شا" (Shaw) اسے برگزیدہ ہستی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح وہ قیصر کو جو بڑی سے بڑی گالی دے سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ "قیصر ایسا گدھا ہے جو سدھایا ہوا نہیں۔"

یہاں یہ بتاتا چلوں کہ قدیم رومیوں اور یونانیوں کی انیسویں صدی کے انگریزوں اور جرمنوں سے بڑی مماثلت و مشابہت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً یونانیوں کی خاص خوبی یہ تھی کہ وہ فکری طور پر ترقی یافتہ تھے اور وہ اپنا اظہار بھی اسی فکری سطح کے مطابق کرتے تھے۔ اس لئے چھوٹی ریاستیں ان کے لئے نہایت

Marfat.com

موزوں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ سکندر اعظم ایک بڑی ریاست نہ چلا سکا۔ مگر رومیوں نے یونانیوں کی فکری ترقی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے طاقت اور قوت کو ایک خارجی روپ دیا۔ اس وجہ سے ایک وسیع سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

رومیوں پر یہ کردار اتنا غالب ہے کہ جدید اٹلی کے باشندے کے لئے آج تک اس پالیسی پر بہترین کتاب سولھویں صدی میں لکھا گیا میکاولی کا "شہزادہ" (The Prince) ہی ہے۔ کچھ عرصہ بیشتر مسولینی نے خود اس بات کا اقرار کیا۔

اسی طرح انگریز قوم کا صحیح اور اصل نظریہ نتیجہ پسند ہونا ہے، یعنی کامیابی کے ساتھ کسی چیز کے غلط یا صحیح ہونے کا فیصلہ کرنا۔ جو بات بہتر نتیجہ سامنے لاتی ہو، وہی اچھی ہے۔ یعنی چال چلت یا روش کا معیار پالیسی ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ قدیم جرمن قوم یونانیوں کی طرح ہے۔ اسی وجہ سے یونانیوں کی طرح جرمن فکری لحاظ سے بہت آگے نکل گئے اور فکری سطح پر انہوں نے اپنا اظہار تصوراتی فلسفہ کی شکل میں کیا۔ مگر پھر اس سلسلے میں ان کے وسیع ذہن اس قدر تنگ نظری کا شکار ہوگئے کہ ہیگل جیسے فلسفی کے نزدیک بھی خدا کا تصور ایک ذہن (Mind) سے بالا نہیں۔

الغرض ہم نے دیکھا کہ انگریز اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع تر بنانے اور ایک عظیم سلطنت تشکیل دینے میں کس قدر کامیاب ہوگئے۔ مطلب یہ ہے کہ فکری قوت کو اگر شعوری طور پر خارجی روپ دینے کی کوشش کی جائے گی اور اسے اپنے فطری رخ میں آگے بڑھنے نہیں دیا جائے گا تو پھر اس سے ایک عظیم قوت تو وجود میں آسکتی ہے، مگر جہاں تک کسی سلطنت کی تعمیر کا سوال ہے تو اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

اب تک ہم نے انسانی کردار کے بنیادی عناصر کو سامنے رکھتے ہوئے

Marfat.com

مختلف قوموں کا جائزہ لیا ہے۔ میں نے یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ انگریز قوم کا سیاسی کردار ہے، جس کی بنا پر وہ برطانیہ کی سلطنت کو قائم رکھنے میں کامیاب ہیں۔ ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ کوئی عوامی تحریک کسی پالیسی کی بدولت ہی جنم لیتی ہے اور عملی طور پر اس کے ذریعے وہ سب حاصل کیا جاسکتا ہے، جسے ہم صرف اصولوں کی حد تک جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ پالیسی گویا کہ اندھی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ انگریز کی سیاست دانی سے برطانیہ کی یہ عظیم سلطنت ہرگز وجود میں نہ آتی، اگر جارج سوئم کی پالیسی نئے امریکا کی دریافت کی لہر سے متاثر نہ ہوتی۔ دراصل اس کے بعد لاشعوری طور پر ہی انگریز قوم ایک اصول اور نظریے سے متعارف ہوئی۔ موجودہ امریکا کی یہ نومولود ریاستیں اور اقوام جو اپنے وطن کی سرزمین کے گرد چمٹی ہوئی ہیں اور جن پر برطانوی قوم کو بھی ناز ہے، یہ بھی دراصل امریکیوں کے احتجاج کا براہ راست نتیجہ ہے۔ اگر اس جذبے کو مزید وسیع کیا گیا تو پھر اس بات کی کافی امید ہے کہ اس کی کوکھ سے بین الاقوامیت جنم لے۔ اس حقیقت سے انگریز کردار کے ایک نئے پہلو کا بھی پتہ لگتا ہے، وہ ہے ماحول سے مطابقت اور مناسبت اختیار کرنا۔ یہاں یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جرمن سائنس اور جرمن فلسفہ انگریز قوم کی ترقی میں اہم عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہاں پہنچنے کے بعد آپ آسانی سے اندازہ کرسکتے ہیں کہ انگریز اصول کی بجائے پالیسی کو کیوں اختیار کرتے ہیں؟ اس لئے کہ یہی اس کا کردار ہے۔ اگر وہ کوئی اور اقدام کرتے تو اپنے کردار کی نفی کرتے۔ اب جس طرح ہر چیز کی خوبیاں اور خرابیاں ہوا کرتی ہیں، اسی طرح یہی بات کردار سے بھی لاگو ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ کردار کچھ وقت تک قائم رہتا ہے۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یعنی دنیا کی ترقی کے بعض مراحل پر وہ کارآمد کم ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً انگریز

Marfat.com

قوم نے یہ کردار سترھویں صدی سے اختیار کر رکھا ہے جس کا تصور قوم پرستانہ اور ایک اعلیٰ انسان والا (Gentleman) ہے۔ انگریزوں میں بچپن سے ہی ایسی خاصیتیں ہوتی ہیں کہ آگے چل کر بین الاقوامی دنیا میں وہ کوئی کردار ادا کرسکتے ہیں، اگرچہ اپنی اصلیت کے لحاظ سے وہ رجعت پرست قومی نظریے کے حامی ہوتے ہیں۔ میں جب امریکہ کو متعدد جدید قسم کی اقوام پر مشتمل ایک ملک کی حیثیت میں دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں اس سلسلے میں کوئی شک شبہ باقی نہیں رہتا کہ یہ ملک آگے چل کر بین الاقوامی تحریک و سیاست میں نہایت اہم کردار ادا کرے گا۔

تضادات کا یہ ایک ایسا شاہکار مجموعہ ہے جو ایک بڑی ہم آہنگی کو جنم دیتا ہے اور اس لحاظ سے بذات خود امریکہ میں بین الاقوامی خصوصیت موجود ہے۔

اس طرح جب آج کی عوامی تحریک دنیا کو ایک بین الاقوامی خاندان کی صورت میں تبدیل کردے گی یا جب مادی تحریک فکری سطح سے آگے بڑھ کر بڑی روحانیت کے درجے پر پہنچے گی تب مختلف مذہبوں کے درمیان موجودہ تضاد بھی کم ہونے لگے گا اور ایک ایک روحانی مذہب ابھرے گا، جسے دنیا کی اقوام اپنا سمجھ کر ضرور اختیار کرے گی۔

یہاں میں یہ بات پھر دہراتا ہوں جو تھوڑی دیر پہلے میں نے عرض کی تھی۔ یعنی پہلے ہندوستان میں جو ماحول تھا، اس نے لوگوں کی فکری خواہ روحانی ترقی کو کہیں نہیں روکا، لیکن شمالی یورپ میں جنگ و جدل کی وجہ سے اس کا رک جانا لازمی امر تھا۔

چنانچہ ہم نے اپنشد جیسے فلسفے تخلیق کیے۔ اس کے علاوہ ہم نے لاتعداد روحانی رہنما پیدا کیے۔ یہاں تک کہ اس سلسلے میں ہم نے اپنی اہم ضروریات کو بھی نظر انداز کردیا۔ بڑی بات یہ کہ ہم ایسے دوررس نظریے کے محتمل نہ ہوسکے

Marfat.com

اور ایسے تصورات رکھ نہ سکے۔ کیونکہ ہم کسی "سیاست" پالیسی کے روادار نہیں تھے۔ بلکہ ہمیں اصول اور نظریات محبوب تھے۔ اب جبکہ بہت سارے لوگ اس اثر کے تحت ہیں تو سیاست نے مذہب کی جگہ سنبھال لی ہے۔ اسی وجہ سے ہم اپنے سیاستدانوں کو مہاتما، سادھو، اچاریہ اور مولانا کہتے ہیں۔ اسی طرح جب آج بھی ہم دنیا کے دیگر ممالک میں جاتے ہیں جہاں قومی کردار دن بدن مستحکم شکل اختیار کرتا جارہا ہے، تو وہاں بھی ہم سے سوائے مذہب کے اور کوئی سوال نہیں پوچھا جاتا۔ ہم امریکہ جائیں، خواہ انگلینڈ یا جرمنی۔ ہر جگہ لوگ ہم سے مذہب اور روحانیت کے بارے میں سوال کرنے لگتے ہیں۔

اس سلسلے میں آپ کو اپنا ذاتی تجربہ سناؤں گا۔ میں نے جب بھی اپنے انگریز دوستوں میں بیٹھ کر سیاست، اقتصادیات یا کاروبار کے بارے میں بات کی ہے تو میں نے دیکھا ہے کہ میں ان کو اپنی طرف متوجہ نہ کرسکا، یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا لاشعوری طور پر انہوں نے فرض کرلیا ہے کہ ان موضوعات پر وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔ بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کو مذہبی معاملات کے بارے میں کچھ بتاؤں یا ان کے سامنے باطنی اور روحانی زندگی پر گفتگو کروں۔ پھر میں نے جب بھی گفتگو کا انداز مذہب اور روحانی مسائل کی طرف موڑ دیا تو دفعتاً میں اس قابل ہوسکا کہ ان کو اپنی طرف متوجہ کرسکوں۔ اسی طرح جب ایک جرمن سائنس اور فلسفے پر بات کرتا ہے تو وہ ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

ایک وقت وہ بھی تھا جب انگریز موجد اپنے کیمیائی مرکبات کو الٹا سیدھا نام دیکر جرمن ناموں سے موسوم کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح جب کوئی انگریز عورت رقص اور موسیقی میں شہرت پر پہنچنا چاہتی تھی تو اپنے لئے ایسا لمبا چوڑا روسی نام تجویز کرتی تھی، جس کا تلفظ بھی مشکل ہوتا

Marfat.com

ہے۔ لیکن اگر درمیانی سطح کا معاملہ ہو تو وہی عورت اپنے آپ کو کسی فرانسیسی نام سے متعارف کرانے لگتی۔ یہ باتیں ایسی ہیں جو کسی قوم کے لاشعور میں چھپے ہوئے مخصوص کردار کو ظاہر کرتی ہیں اور یہ اقوام اس کردار اور کرداروں میں یقیناً اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔

یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو مذہب کے دیس ہندوستان واپس لے چلوں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہندوستان کی مذہب اور روحانیت میں شہرت اور وابستگی کا پہلا سبب اس کے اردگرد کا ماحول ہے۔ اس کے بعد مذہب نے ایک عامل کی حیثیت میں ہندستانیوں کے مخصوص کردار کی تعمیر کی ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ پچھلے چار ہزار برس سے یہ سفر جاری ہے۔ چنانچہ ہم موجودہ زمانے میں بھی تمام خارجی اثرات کے باوجود مذہبی اصطلاحات میں گفتگو کرنے لئے مجبور اور عادی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مذہب ہمارے رگ و ریشہ میں رچا بسا ہوا ہے۔ اس لئے یہ ایک ہندوستانی کا ایک مخصوص کردار ہے کہ روحانیت سے اس کی آشنائی، آگاہی اور وابستگی مسلمہ ہے، جس کی بنا پر وہ بیرونی وضع قطع اور مطلب براری سے پاک ہوتا ہے۔ وہ ظاہری دنیا کو "مایا" یا فریب کاری تصور کرتا ہے۔ "مایا" کے لفظ سے آپ جو بھی مطلب اخذ کریں۔ لیکن فرئنسس ھامپسن قوانی کے مطابق جس آدمی نے دنیا میں شراب (حقیقی) کا مزا چکھ لیا ہو، جو اس دھرتی کو بکواس اور زندگی کو ناقابل برداشت قرار دیتا ہو، وہ چند اہم ضروریات کی وجہ سے یہ ساری باتیں بھلا نہیں سکتا۔ آج کے زمانہ میں دنیا کے سارے مذاہب ترقی کر رہے ہیں، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ یہ سب تضادات کی صورت میں ترقی کر رہے ہیں۔ لیکن اگر آپ اس گہرائی میں جائیں گے۔ تو آپ کو معلوم ہوجائیگا کہ ہندوستانی زرتشت دوسرے زرتشتوں کے مقابلے میں بہت اچھا ہے۔ یہی حال ایک ہندوستانی ویدانتی، مسلمان یا بدھ مت کے

پیروکار کا ہے۔ یہ سب اپنے نوع میں بہترین ہیں۔ یہ سب کچھ اس دھرتی کی وجہ سے ہے۔ اسی وجہ سے مجھے امید ہے کہ ہندوستان بین الاقوامی حیثیت میں وہ نظریہ اور فلسفہ پیش کرسکتا ہے جس کے بغیر ایک خاندان کا وجود محال ہے۔ بلکہ جس کے بغیر ایک فطری کل وجود میں نہیں آسکتا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس دھرتی پر ہی مذہبی تضاد کی بڑی سے بڑی صورت نظر آتی ہے۔ میں یہاں یہ بات پھر دہراتا ہوں کہ بڑی سے بڑی ہم آہنگیت کا رُستہ تضادات سے نکلتا ہے۔

اب میں آپ کی توجہ ایک اور اہم حقیقت کی طرف مبذول کرواتا ہوں۔ میں نے ابتدا ہی میں کہا تھا کہ جو طاقت اندر سے پیدا ہوتی ہے، وہی طاقت لوگوں کو متحرک اور فعال کرسکتی ہے اور وہی طاقت عالمی تحریک کی صورت اختیار کرتی ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر کوئی قوت باہر سے اندر آتی ہے اور نیچے سے اوپر کی طرف آنے کے لئے کوشاں ہوتی ہے تو اس صورت میں وہ عوامی تحریک پاپولر ہونے کی بجائے گھٹنا شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ عروج کے زمانے میں بھی ایسی تحریک چند افراد پر مشتمل رہ جاتی ہے۔ پھر جتنا زیادہ وقت وہ تحریک چلتی ہے، اتنا ہی زیادہ وقت رہنماؤں کے پیدا ہونے میں لگتا ہے۔ اسی طرح اگر ان میں دیر سے کوئی لیڈر اور رہنما پیدا ہوگا، عوام میں اسی تناسب سے سستی، کاہلی، غفلت اور بے عملی پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں مختلف ادوار میں لوگوں کی کاہلی، سستی اور بے عملی پیدا ہونے کا بڑا سبب یہی ہے۔

دوسرا سبب جس کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کرچکا ہوں، یہ ہے کہ دنیا میں ایک کل کی حیثیت میں ترقی دراصل متضاد تحریکوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پس اس وجہ سے خواہ کوئی تحریک کتنی بھی ترقی پسند کیوں نہ ہو، مگر ممکن ہے

کہ وقتی حالات اور تقاضاؤں کی وجہ سے وہ نامقبول اور ناکام ہوجائے۔ اس صورت میں ایسی تحریک کچھ عرصے کے لئے گویا ملتوی ہوجاتی ہے، تاآنکہ اس کا دوبارہ وقت آجائے۔

سقراط کو اس کے نظریات کی وجہ سے زہر دیا گیا اور حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چاڑھنے کی کوشش کی گئی تو نہ سقراط یونانیوں کی تقدیر تبدیل کرسکا اور نہ ہی رومی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہنے کے لئے تیار ہوئے۔ مگر سوفسطایوں نے بہت کچھ کر دکھایا، اسی طرح رومی سلطنت بھی بعد میں بہت پھلی پھولی۔ اسی لئے ہندوستان کا مستقبل ابھی آگے ہے۔ بہرحال پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسا ردعمل اور ایسی تحریک برپا کی جائے، جس کے ذریعے خارجیت کو تقویت پہنچائی جاسکے۔ عربوں کے سامنے اصل مقصد یہی تھا جو ان کو یہاں لے آیا اور انگلستان والوں کے سامنے بھی براہ راست یا بالواسطہ طور پر مقصد یہی تھا۔ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھنی چاہیئے کہ آئندہ کچھ وقت کے لئے یہ تحریک اسی طرح جاری رہنی چاہیئے، تاکہ وہ مواد کٹھا ہوسکے، جس سے زیادہ اعلیٰ، عمدہ قسم کی صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے اردگرد مادی جذبات کا پھیلا ہوا جال عام لوگوں کو اس طرح ابھار رہا ہے کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، لیکن وہ لہر ہم تک پہنچ کر رہتی ہے۔ اسی وجہ سے آج ہندوستان کے اکابرین کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اصلی اور صحیح کردار سے آگاہی حاصل کریں اور مستقبل کی ذمہ داریوں کا اچھی طرح مطالعہ کریں۔ اسی طرح ان کو چاہیئے کہ مادی تحریکوں سے بھی پوری طرح فائدہ اٹھائیں اور اپنے عوام کو اتنا اونچا لے آئیں کہ وہ اپنی طبعی اور فکری قوتوں کی اہمیت کو بھی محسوس کرسکیں۔ یورپی قوموں نے گذشتہ دو صدیوں میں ایسا ہی کیا ہے اور اسی طرح کرتی رہیں گی۔ خواہ ان کے سامنے کتنی مخالف قوتیں کیوں نہ ہوں۔ البتہ ہندوستانیوں کا کردار زیادہ تر باطنی یا اندرونی

Marfat.com

ہے۔ اس لئے جب مادی جذبہ روحانی ترقی کا خواہشمند ہوتا ہے تو اس آبائی اور موروثی پیشے کو بہتر طور پر ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مجھے گوئٹے کے الفاظ سے زیادہ مناسب الفاظ نہیں ملتے۔ وہ کہتا ہے وہ کُل ہی ہے جس میں سچ اور نیکی مستقل طور پر رہ سکتے ہیں۔

اگرچہ میں شروع میں ہی یہ بات عرض چکا ہوں کہ ہم انسانی فعل کو مصنوعی طور پر تقسیم کرچکے ہیں یعنی جسمانی، فکری اور روحانی سطحوں پر بانٹ چکے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اس تقسیم کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے علاوہ ہر ایک سطح کا دوسری سطح سے تعلق بھی ہے۔ نیز ایک دوسرے کا ردعمل بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً: جسمانی تکلیف فکری بیماری کو بھی اپنے ساتھ لے آتی ہے چنانچہ ہم روحانی جستجو کے لئے زیادہ روادار نہیں رہتے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی ایک فکری کُل ہے، لہذا اس کی ہمہ گیریت پر زور دینا چاہیئے۔ البتہ اگر ہم چند خاص خصوصیتیں رکھتے ہیں تو اس کے لئے ہمیں خصوصی توجہ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ بہرحال ایک ولی کو بھی کھانا کھانے اور نیند کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بقول امام غزالی: ہمیں اپنی سواری کی حفاظت کا انتظام کرنا چاہیئے تاکہ اس پر سواری کی جاسکے، دوسری صورت میں ممکن ہے کہ وہ صحرا میں گر پڑے اور اپنا سفر پورا نہ کرسکے۔

اس کے علاوہ وہ حالات جو ہمیں روحانیت کی جانب مائل کرتے ہیں، وہ بھی تیزی سے ختم ہوتے جارہے ہیں۔ ماضی میں انسان کی مادی ضروریات بآسانی پوری ہوسکتی تھیں۔ آرام کے لئے بھی ہمیں کافی وقت مل جاتا تھا۔ آج کل بہت سارے لوگ کھانے کے لئے ترس رہے ہیں۔ زندگی کا یہ مسئلہ اتنا گھمبیر ہوتا جارہا ہے کہ جسم اور روح کا تعلق قائم رکھنا مشکل ہوگیا ہے۔ اس لئے جب تک ہم اس صورتحال کا سامنا نہیں کرتے اور ایسے معاشی حالات پیدا نہیں کرتے، جن

Marfat.com

میں نہ صرف جسمانی پرورش کی جا سکے، بلکہ ذہن بھی اچھی طرح نشوونما حاصل کر سکے، اس وقت تک دوسری صورت میں جو روح باقی بچے گا وہ اظہار کی قوت سے محروم ہو جائے گا اور لازمی طور پر خراب ہو کر فاسد ہو جائے گا۔

اس لئے بالواسطہ طور پر یہ بات ثابت ہو چکی کہ اگر ہم اپنی روایات کو قائم و دائم رکھنا چاہتے ہیں اور مستقبل کے فرائض ادا کرنا چاہتے ہیں تو پھر ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام الناس کے جسم اور ذہن کی غذا کا مناسب بندوبست کیا جائے۔ گوئٹے کا اوپر جو مصرعہ دیا گیا ہے اس میں "گُل" کا جو مطلب ہے وہ یہی ہے۔ اس مصرعے میں دوسرے خاص الفاظ جس کی طرف میں توجہ مبذول کراؤں گا، مستقل قوت ہیں، کیونکہ مستقل ارادے کے سوا عمل ناممکن ہے۔ اور ارادے کی کمی کردار کی کمی کا پختہ ثبوت ہے۔ وہ کردار خواہ کیسا بھی ہو اور جب تک کردار کی یہ خاصیت مضبوط بنیادوں پر قائم نہ ہو اور جب تک وہ ظاہری خواہ باطنی عمل پر اثر انداز نہیں ہوتا، اس وقت تک اسے کردار کا نام دینا فضول ہے۔

آپ کو اتنی ساری تکلیف دینے کے بعد اور قبل اس کے کہ میں اپنی یہ تقریر ختم کر کے اپنی جگہ پر جا کر بیٹھوں، میں خاص خاص باتوں کو یہاں دہراتا ہوں۔ ہندوستان کی بنیادی اور خاص خاصیت اس کی روحانیت ہے۔ دوسری سب چیزیں اس مقصد کے لئے ذریعے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ ذرائع و وسائل بھی نظرانداز کرنے جیسے نہیں ہیں۔ مگر ان ذرائع کو اگر منتہائے مقصود سمجھا گیا اور وہ دور رس نگاہ اور گہرائی جو ہمارے رگ و ریشہ میں موجود ہے اور ہمیں بطور ورثہ کے حاصل ہوئی ہے، وہ گم ہو گئی تو پھر ہندستانیوں کے لئے وہ دن ماتم کا دن ہو گا۔ اس وقت آنکھوں میں آنسو لا کر یہ پوچھنا پڑے گا "جب نمک کا اپنا ذائقہ ختم ہو جائے تو پھر وہ کس چیز کو نمکین بنا سکے گا۔"

Marfat.com

# اقبال

(اپریل ۱۹۵۸ء میں کراچی میں علامہ اقبال کا دن منایا گیا۔ اس موقعہ پر علامہ صاحب نے درج ذیل تقریر کی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من کان یرید الحیوٰۃ الدنیا وزینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لا یبخسون * اولئک الذین لیس لھم فی الاخرۃ الا النار وحبط ما صنعوا فیھا وباطل ما کانوا یعلمون*

واوحیٰ ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا ومن الشجر ومما یعرشون * ثم کلی من کل الثمرات فاسلکی سبل ربک ذللا یخرج من بطونھا شراب مختلف الوانہ فیہ شفاء للناس ان فی ذلک لایۃ لقوم یتفکرون*

میں: اقبال اکیڈمی کے صدر اور کونسل کے ممبران کا ممنون ہوں، جنہوں نے مجھے یہ موقعہ فراہم کر کے اس تقریب میں آپ کے ساتھ شریک ہونے کی عزت بخشی۔

مٹی کی نئی زندگی پھول ہو یا یوں کہا جائے کہ گِل میں سے ہی گُل (پھول) پیدا ہوتا ہے۔ دوسری جانب شاعر بننا شہد کی مکھی کا مقدر رہا۔ اقبال (دیوان غالب) کے تصاویر والے ایڈیشن "مرقعہ چغتائی" کے مقدمے میں لکھتے ہیں: دور جدید فطرت سے انعام حاصل کرتا ہے، لیکن فطرت تو محض "ہست" یا "ہونا" (Is) کا نام ہے اور یہ کس طرح ہونا چاہئیے (Ought) اس سلسلے میں فطرت خود ہماری تلاش میں بنیادی رکاوٹ ہے، مگر یہی وہ بات ہے، جس کا جواب ایک فنکار کو ایک وجود کی گہرائیوں میں تلاش کرنا پڑتا ہے۔

Marfat.com

اقبال کے یہ الفاظ کچھ الجھانے والے ہیں، کیونکہ اس کا مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ فنکار کے "ہونے کو" "کس طرح ہونا چاہیئے" سے ہم آہنگ کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کرنی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کے نزدیک فطرت ہماری زندگی میں اہم کردار ادا نہیں کرتی۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اقبال خود کہتا ہے:

نوائے من ازان پر سوز و بے باک و غم انگیز است،
بخاشاکم شرر افتاد، و باد صبحدم تیز است

(میری آواز اس وجہ سے سوز و گداز سے معمور، بے باک اور درد انگیز ہے کہ میرے خس وخاشاک سے بنے ہوئے جھوپڑے پر ایک شعلہ آ کے گرا ہے اور باد صبا بھی تیزی سے چل رہی ہے)

یہاں ظاہر ہے کہ باد صبحدم سے مراد کائنات اور فطرت ہے، جو شعلے کو بھڑکانے میں مدد ومعاون ہو رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت نے خود ایک فنکار میں "ہست" یا "ہونے" کو "کس طرح ہونا چاہیئے" سے ہم آہنگ کردیا ہے۔ اس لیے فنکار کا یہ کام ہے کہ ان دونوں یعنی "ہونے" اور "کس طرح ہونے" کے درمیان میں جو تفریق ہے اس کو اپنی نغمہ سرائی کے ذریعے حل کرے۔ پس اگر حقیقیت اسی طرح ہے تو پھر اس نغمہ سرائی پر اتنی تنقید کس لئے؟ لہذا "یتبعهم الغاوٗن" (شعراء کے پیروکار گمراہ ہوتے ہیں) کی سرزنش کس وجہ سے؟ بلکہ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "اشعر الشعراء قائدهم الی النار" یعنی سب سے بڑا شاعر انہیں آگ کی طرف کھینچتا ہے۔ اگرچہ اس میں یہ ترمیم بھی ہے کہ "ان من البیان سحرا" یعنی بیشک شاعری میں جادو کا سا اثر ہے۔ یا "ان من الشعر لحکمة" یعنی شاعری میں حکمت ہے۔ اس لئے یوں نظر آرہا ہے کہ

Marfat.com

شاعر دو قسم کے ہیں بعض حکمت بھری باتیں کرتے ہیں اور دوسرے آگ کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس بات کی طرف ہلکا سا اشارا اقبال کے مذکورہ مقدمے کے آخری حصے میں ملتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

جہاں تک اسلامی ثقافت کا تعلق ہے، میرا عقیدہ ہے کہ عمارت سازی کے فن کے علاوہ دوسرے فنون لطیفہ مثلاً موسیقی، مصوری، خواہ شاعری بھی ابھی وجود پذیر نہیں ہوئی، ان کو وجود میں آنا ہے یعنی وہ فن جس کے ذریعے انسان اپنے اندر تخلقوا باخلاق اللّٰہ کی صفات پیدا کر سکے۔

یہاں اس بات کی طرف واضح اشارہ موجود ہے کہ صرف شاعری میں ہی مختلف اقسام ہیں بلکہ "اسلامی شاعری" اور "اسلامی آرٹ" کے بھی امکانات موجود ہیں۔ اس مقام پر یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ شاعری کی اس تقسیم کا ذکر نہ صرف قرآن مجید اور اقبال نے کیا ہے، بلکہ یونانی دور سے لے کر جب افلاطون نے کہا تھا کہ "جمہوریت" میں شعراء نہیں ہوا کرتے تو اس کا یہی مطلب تھا۔ زیادہ قریبی دور میں ٹالسٹائی بھی موسیقی سمیت اپنے دور کے تمام فنون لطیفہ کا سخت مخالف تھا۔ اب آئیے "مشکوک آرٹ" کے خطرات کے بارے میں، اقبال نے مذکورہ بالا کتاب کے مقدمے میں جو کچھ کہا ہے، اس پر غور کریں۔

"قوم کی روحانی صحت کا زیادہ تر دارومدار اس الہام پر ہے جو شعراء اور فنکار لوگوں کو پلے پڑتا ہے، مگر یہ الہام اپنے اختیار میں نہیں ہے کہ اس کا انتخاب کیا جا سکے۔ یہ تو قدرتی دَین ہے اور جب تک کسی کو یہ قدرتی دین حاصل نہ ہو، اس کی تمیز تک نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے زوال پذیر نوعیت کا الہام جو اس قسم کی شاعری یا مصوری کا سبب بنتا ہے اور عام لوگوں کو اپنی طرف راغب

Marfat.com

کرنے کی قوت رکھتا ہے وہ اٹیلا اور چنگیز خان کی فوج ظفر موج سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔''

ہمیں اقبال کے ان الفاظ پر خواہ مخواہ تشویش کی ضرورت نہیں۔ (کیونکہ اس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے) جیساکہ ہم نے اوپر ذکر کیا کہ ایک فنکار کو "تخلقوا باخلاق الله" کے عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لئے شعوری طور پر جدوجہد کرنا ہوگی، بلکہ اس دوران ہم اس معاملے کا جائزہ لیتے ہیں کہ "اسلامی شاعری" غیر اسلامی شاعری سے کس قدر مختلف ہے؟ اب جبکہ ہم یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ فن کے مختلف اقسام واصناف ہیں تو ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ اقبال کا فن کس نوعیت کا ہے اور کیا ان کا یہ فن "اسلامی شاعری" کے زمرہ میں شامل ہوسکتا ہے؟

یونانیوں اور ٹالسٹائی کے درمیانی عرصے میں اقبال کے مرشد مولانا رومی آتے ہیں۔ شاعری کے بارے میں مولانا کی رائے ہم خود انہیں کے الفاظ میں ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ برسبیل تذکرہ حضرت عمرؓ کا یہ قول بھی سن لیں، فرماتے ہیں: كان الشعر علم قوم لم يكن لهم علم اصح منه (شعر بھی قوم کا علم ہے) اس سے زیادہ صحیح علم ان کے پاس اور نہیں ہوتا تھا) مولانا رومی کی شاعری کے بارے میں انکی اپنی رائے اس طرح ہے:

"یاراں کہ نزد من آیند از بیم آن کہ ملول شوند۔ شعر می گویم تابدان مشغول شوند۔ ورنہ من کجا شعر از کجا! واللہ کہ من از شعر بیزارم۔ پیش من بدتر ازاں چیزی نیست"

(یعنی میں ان دوستوں کے کبیدہ خاطر ہونے کے اندیشے کی وجہ سے جو میری صحبت کی خاطر آتے ہیں، شعر کہتا ہوں، تاکہ وہ مشغول رہیں، ورنہ کہاں میں اور کہاں شعر وشاعری؟ اللہ کی قسم، میں شعر گوئی سے بیزار ہوں، میرے نزدیک اس سے خراب اور کوئی چیز نہیں)

Marfat.com

معلوم ہوا کہ مولانا رومی اپنے احباب اور دوستوں کی تفریح طبع کے لئے شعر کہتے تھے، ورنہ بذات خود وہ شعر و شاعری سے بیزار و متنفر تھے، اب ہم علامہ اقبال کے اپنے الفاظ جو انہوں نے اپنی شاعری کے بارے میں کہے ہیں، پیش کرتے ہیں:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ
نہ بادہ ہے، نہ صراحی، نہ دورہ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگین ہے بزم جانانہ

واضح ہوا کہ اقبال "نگاہ" کو شاعری کے لئے روح سمجھتے ہیں اور باقی سب باتیں ان کی نظر میں اس کے اظہار کا ذریعہ اور ساز و سامان ہیں۔ وہ اپنی اس "نگاہ" کا تصور اس طرح کھول کر نمایاں کرتے ہیں:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں،
ترا علاج نظر کی سوا کچھ اور نہیں۔

وہ اپنے نقطۂ نگاہ کی مزید وضاحت مندرجہ ذیل خوبصورت اشعار میں کرتے ہیں:

اقبال نے کل اہل خیابان کو سنایا
یہ شعر نشاط آور و پرسوز و طربناک
میں صورت گل دست صبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے میرا جوش جنون میری قبا چاک

دوسری جگہ اسی نکتہ کو اس طرح واضح کرتے ہیں:

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن،
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا۔

Marfat.com

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا،
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے۔

قارئین کو زیادہ بیزاری سے بچانے کی خاطر اتنا بتاتا چلوں کہ اس کے بعد آنے والا آخری شعر لفظ "معنیٰ" کو ظاہر کرتا ہے، جس کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔

جس معنیٰ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں وہی بڑھ کر ہے تابندہ گہر سے

مولانا رومی تو اس سے بھی بہت آگے نکل گئے ہیں، بلکہ گستاخی کی حد تک، کہتے ہیں:

ما ز قرآن مغز را برداشتیم
استخوان پیشِ سگان انداختیم

ان ساری باتوں سے قارئین پر یہ بات واضح ہو چکی ہو گی کہ اقبال کی پوری توجہ "معنیٰ" پر مرکوز ہے نہ کہ ظاہر یا "صورت" پر۔ بہر حال ایسا ہر گز باور نہیں کرنا چاہئے کہ انہوں نے صورت کو یکسر نظر انداز کر کے خود کو صرف معنیٰ سے وابستہ کر لیا ہے بلکہ اس طرح اصل صورتحال کو سمجھنے میں غلطی ہو گی۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ جان بوجھ کر صورت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے لئے القا یا الہام یا انسان کا ذریعہ صرف "معنیٰ" ہے اور نہ "صورت" اس قسم کا الہام جیسا کہ علامہ اقبال خود فرماتے ہیں خدائی دین ہے۔

**ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**

یعنی ان کا الہام "صورت" کی سطح کا نہیں، بلکہ یہ فکر و نظر کی سطح پر ابھرتا ہے۔

اب یہ بات ہمیں شاعری کے اس کلاسیکی رجحان کی طرف لے جاتی ہے،

Marfat.com

جوایک مرتبہ ملٹن نے خود مرتب کیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ شاعری سادہ، جذبات کو ابھارنے والی اور جوش سے بھرپور ہونی چاہیئے۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال جذبات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ ہم نے اوپر جو اشعار نقل کئے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہورہا ہے کہ وہ نہ جذباتیت کا شکار ہوتے ہیں اور نہ حساسیت کا ........... ان کی ذات "نظریے" یا "معنیٰ" کی سطح تک متحرک ہوتی ہے، اس لئے قدیم زمانے کے تصادات جو اپنے اشعار کو "ناصحانہ نظم" کہتے ہیں جو درحقیقت شعر کہلانے کا مستحق ہی نہیں، کیونکہ ان کی نگاہ میں شاعری کا جذباتیت سے وابستہ ہونا لازمی امر تھا۔ کوئی بھی غنائی شاعری جذبات کی شدت کے بغیر جنم نہیں لے سکتی۔ چنانچہ وہ کسی نظریے کے تحت شاعری کو "خشک فلسفیانہ تعلیم" کے برابر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نگاہ میں ایسی شاعری الہامی ہونے کی بجائے محض تک بندی اور قافیہ بندی کی شاعری کا روپ دھار لیتی ہے، لیکن یہاں اقبال "صورت" کو ضروری نہیں سمجھتے، وہ صرف "معنیٰ" سے سروکار رکھتے ہیں اور بس۔

مولانا رومی اس سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ وہ "صورت" کی کسی بھی نوعیت سے سروکار رکھنا نہیں چاہتے۔ امام غزالی اپنے یگانہ فلسفیانہ انداز میں اس بات کو یوں پیش کرتے ہیں کہ "آنے والا جہان معانی کا جہان ہے، نہ صورت کا"

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا "معانی" "صورت" کا لباس پہنے بغیر ہم تک پہنچ سکتی ہے؟ اسی طرح خیال یا فکر کو صرف "علامت کی معنیٰ" (Meaning Symbol) کہا گیا ہے، اس کے باوجود علامات کے بغیر خیالات کا وجود نہیں۔ قطع نظر اس امر سے کہ وہ خیالات فطری ہوں یا زبان کے الفاظ کے ذریعے ظاہر ہوں لیکن وہ ہر حالت میں علامتوں کے اظہار کا تقاضا کرتے ہیں اور

Marfat.com

انہیں سے وابستہ رہتے ہیں، اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ بیشک ظاہری "صورت" کو ختم نہیں کیا جاسکتا، مگر سارا زور بیان "معنیٰ" پر دیا جاتا ہے نہ "صورت" پر۔

اس بات کو ایک مثال کے ذریعے واضح کیا جاسکتا ہے۔ قدیم زمانے میں پلاٹ کی دریافت اور قصے کی اصلیت پر بہت زور دیا جاتا تھا، بلکہ اس کو ادبی تخلیق کی خاص خوبی سمجھا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے آکر اس صورتحال کو تبدیل کردیا۔ بیشک اس میں قدیم قصے بیان کئے گئے ہیں، لیکن بالکل نئی معنوی اہمیت کے ساتھ۔ اب قصہ خود اہمیت کا حامل نہیں رہا، بلکہ اصل اہمیت اس نئے شراب کی ہے، جو پرانی بوتلوں میں بھری گئی ہے، لیکن اقبال اس شراب سے بھری ہوئی بات سے بھی راضی نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ شراب سے بھی آگے اس کی اہمیت کو تلاش کرتے ہیں۔

یارب درونِ سینہ دل باخبر بدہ
در بادہ نشہ رانگرم آن نظر بدہ

(اے میرے پروردگار! مجھے ایک باخبر دل عطا فرما، مجھے ایک ایسی نگاہ عطا فرما، جس کے ذریعے شراب کے اندر پنہاں نشے کو دیکھ سکوں)

قرآن مجید کی اس تحریک نے ادبی دنیا میں ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی، جس کا بعد میں بہت سی قوموں کے ممتاز ادیبوں اور شعراء نے لاشعوری طور پر تتبع کیا۔ ڈانٹے اور شیکسپیئر نے ایک پرانہ قصہ لیکر اسے نئے معانی پہنانے کی کوشش کی۔ شیکسپیئر کے سارے پلاٹ پرانے قصے ہیں، انہوں نے ایک بھی نیا قصہ تخلیق نہیں کیا، لیکن انہوں نے اسے جو معانی دئے ہیں، وہ بلکل نئے ہیں۔ اس کے بعد ملٹن نے بھی اسی طرح کیا، اسی طرح مشہور جرمن ادیب گوئٹے نے بھی فطری طور پر یہ طریقہ اختیار کیا۔ مثلاً فاسٹس (Faustus) اور افیجینا (Iphegenia) کے قصوں پر پچھلے ادیب بھی طبع آزمائی کر چکے تھے۔ مگر

Marfat.com

گوئٹے کے لکھے ہوئے فاسٹس اور افیجینا کی معنوی اہمیت پچھلے ادیبوں سے بالکل مختلف اور نرالی ہے۔ یہ سب باتیں ثابت کرتی ہیں، جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ جب سے دنیا میں قرآن آیا ہے تب سے پوری معانی کو اہمیت ملنا شروع ہوئی ہے اور نہ ظاہری صورت کو۔

مگر یہاں زیادہ وضاحت طلب بات صرف یہ ہے کہ اسے اسلامی کس طرح کہا جاسکتا ہے؟ ہم یہ بات کہہ چکے ہیں کہ اس روایت کی بنیاد قرآن مجید نے ڈالی، مگر یہ ہمارا فقط ایک اندازہ ہے۔ اسلامی تاریخ کے موجودہ مرحلے کی اہم تقاضا یہ ہے کہ ہم جو خود کو مسلمان کہلاتے ہیں، انسانی ارتقا کے بارے میں اسلام کے نقطہ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یورپ جب بلوغ کو پہنچا تو وہاں سرے سے اس بات کا انکار کیا گیا کہ مذہب بھی کوئی ارتقا یافتہ ہوسکتا ہے، اور مذہب بھی کوئی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا مکمل زور یہودیت، اسلام اور عیسائیت کی ترتیب پر تھا۔ وہ اسلام کو عیسائیت سے پہلے رکھنے کے لئے تیار نہ تھے، کیونکہ اس طرح عیسائیوں کی تاریخی اہمیت اور حیثیت گھٹ رہی تھی۔ اس کے باوجود سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ یہ تاریخ سے جان بوجھ کر مذاق کرنے کی کوشش ہے، بلکہ پوری تاریخ کو غلط قرار دینے اور مسخ کرنے کی کوشش ہے۔

سوال یہ ہے کہ اسلام اور دیگر مذاہب کے درمیان کیا خاص فرق اور اختلاف ہے؟ اولین اور بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام میں ظاہری رسم و رواج کو صرف روا رکھا ہے، جبکہ اس سے پہلے کے مذاہب کا پورا زور رسم و رواج اور ظاہری پابندیوں پر تھا۔ کوئی بھی مذہبی کام پادری اور پنڈت کے ہاتھوں تقریب اور رسم کے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ نیز اس رسم کی ادائگی مقرر کردہ طریقے، ماحول اور مخصوص جگہ کے سوا نہیں ہوسکتی تھی۔ قطع نظر اس سے کہ وہ عیسائیوں کا کلیسا ہو یا یہودیوں کا کنیسا، بہرحال اس کا وجود لازمی امر تھا۔ حد تو یہ

Marfat.com

ہے کہ کسی بھی پیروکار کے لئے اس سے آگے سوچنا تک گناہ تھا، حتی کہ ایک فارسی شاعر کو یہ کہنے کا موقع ملا:

تاز بخششہائے آن سلطان دین،
مسجد ما شد ہمہ روئے زمین۔

(ترجمہ) یہاں تک کہ اس سلطان دین کی مہربانی کی وجہ سے روئے زمین ہمارے لئے مسجد بن گئی۔

یہاں مجھے تھوڑی دیر کے لئے اصل موضوع سے ہٹنے پر معاف کیجئیے گا۔ نامناسب نہ ہوگا اگر میں آپ پر یہ واضح کروں کہ آخر میں نے اس تقریب میں شرکت کے لئے کراچی آنا کیوں قبول کرلیا؟ سبب یہ تھا کہ گذشتہ ماہ مارچ میں ہمارے یہاں بھی کانفرنسیں ہوچکی ہیں، ان میں سے ایک کا موضوع تھا سماجی علوم (Humanities) دوسرے کا موضوع تھا "فلسفہ"۔ ان دونوں میں مجھے کسی نہ کسی حیثیت میں شرکت کرنا پڑی، بلکہ مجھے یہ موقع ملا کہ سائنس اور فلسفے کی اسلام میں حیثیت اور نقطہ نظر کو تفصیل سے پیش کروں۔ بعینہٖ آج کا موقعہ پھر میں نے غنیمت سمجھا تاکہ میں فن اور اسلام کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرسکوں۔ بالخصوص علامہ اقبال کی اس رائے کے حوالے سے جب وہ کہتے ہیں کہ اسلامی آرٹ ابھی وجود میں آیا ہی نہیں۔ اب تک ہم نے بالواسطہ یا بلاواسطہ صرف شاعری کے سلسلے میں ہی بات کی ہے۔ اس سلسلے میں مزید چند الفاظ اسلامی نقطہ نگاہ سے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اقبال کی دوسری اصطلاح "فطرت" کے بارے میں ہم نے کافی گفتگو کی ہے۔ اگرچہ وہ بعض مواقع پر فطرت کو "ہست" (Is) کا نام دیتے ہیں۔ آرٹ یعنی "کس طرح ہونا چاہئیے" (ought) سے جدا کرتا ہے، یا یہ تاثر دیتے ہیں کہ آرٹ فطرت سے جدا یا باہر کی چیز ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کی خاطر ذیل میں ہم شیکسپیئر

Marfat.com

کی درج ذیل سطور پیش کریں گے:

"فطرت کو کسی بھی طرح سے بہتر نہیں بنایا جاسکتا، بلکہ فطرت خود اس روش کو وجود میں لاتی ہے۔"

اب آئیے اس سلسلے میں قرآن پاک کے بنیادی نقطہ نظر کا بھی جائزہ لیں۔ قرآن مجید کی ابتدا "اقرا" (پڑھ) کے لفظ سے ہوتی ہے۔ اقرأ کا یہاں مطلب ہے "علامت کے معنیٰ پڑھ" دوسری طرف قرآن مجید کے لئے پوری فطرت ایک علامت ہے۔ اور آپ کو کوشش کر کے اس کے معانی کو سمجھنا ہے۔ ایک بار جب آپ کو اس کے معانی سمجھ میں آجائیں تو پھر "بیان" کا استعمال کریں جو آپ سیکھ چکے ہیں۔ اب بیان دونوں طریقوں یعنی تحریر اور زبانی طریقے سے ہوتا ہے۔ البتہ قلم اور لکھنے پر زور قرآن پاک کی سورۃ نٓ والقلم ومایسطرون سے بالکل واضح ہے اور یہ سورۃ نزول کے اعتبار سے اقرأ کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا قرآن مجید کے یہ بالکل ابتدائی الفاظ بعض ایسے اقدار کی نمائندگی کرتے ہیں جو اس سے پہلے موجود تھے؟ قرآن مجید سے پہلے ہمیں حیاتیاتی سطح پر صرف دو بنیادی اقدار کی معلومات حاصل ہوئی ہے۔ اولاً زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے کھانے پینے کی اشیاء کا انتظام کرنا۔ ثانیاً نوع انسانی کے تسلسل اور بقا کو قائم رکھنا۔ یہاں ان دونوں اقدار کی نمائندگی یوں کی گئی ہے کہ "اقرأ" کو ذہنی خوراک قرار دیا گیا اور تخلیقی عمل کے لئے اظہار ذات کو سرچشمے کا درجہ دیا گیا۔ چند الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ حیاتیاتی یا جسمانی سطح کے اقدار کو روحانی اقدار میں بدل دیا گیا ہے۔ پچھلے مذاہب اور اسلام میں یہی ایک بنیادی اہمیت کا حامل فرق ہے۔ اسلام میں مادی زندگی محض ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے، باقی سارا زور روح اور وجدان پر دیا گیا ہے۔ جیساکہ اس آیت میں ہے: المال والبنون زینة الحیاة الدنیا یعنی مال اور اولاد اس دنیاوی زندگی کی زینت

Marfat.com

ہے۔ آپ کی حقیقی اولاد آپ کے روحانی بچے ہیں۔ آپ کا وجدان یا روح جو کچھ تخلیق کرتا ہے، وہی آپ کی اولاد ہے۔ جو لوگ اتنی بات سمجھ سکتے ہیں، ان کو مذہب کے تاریخی ارتقا میں اسلام کے حقیقی مقام اور حیثیت کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آنی چاہیئے۔ ان چند ابتدائی کلمات کے بعد ہم فن کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔ بالخصوص یونانیوں کے حوالے سے، کیونکہ سائنس اور فلسفے کی صورت میں بھی ہم نے وہیں سے ابتدا کی ہے۔ فلسفہ کے بارے میں منعقدہ کانگریس مؤرخہ ۱۵ مارچ کے پانچویں اجلاس میں ہم نے یونانیوں بالخصوص ارسطو کے اخلاقیات اور منطق کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس مخصوص مرحلے پر انسان نے اپنے دل و دماغ کے بارے میں ابتدائی شعور حاصل کرنا شروع کیا تھا۔ بلکہ جس طرح چھوٹا بچہ گفتگو کی ابتدا توتلے پن سے کرتا ہے، پھر آہستہ آہستہ بولنے لگتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ صحیح تلفظ زبان سے ادا کر سکے اور اپنا مطلب بیان کر سکے، بالکل یہی حالت یونانیوں کی تھی۔ اگرچہ دنیا کے دیگر حصوں میں انسان اس منزل سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ مثال کے طور پر چین میں کنفیوشس کا اخلاقی فلسفہ ارسطو کے اخلاقیات سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ مگر جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ مغرب کو جب اچانک بیدار ہونے کے بعد اپنی ذات کا شعور حاصل ہوا اور ان کے اندر قوت فکر پیدا ہوئی تو انہوں نے اپنے فلسفے کا آغاز یونانیوں کے فلسفے سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ آج تک ان کی یہی حالت ہے، وہ طاقت کے نشے میں اتنے بدمست ہیں کہ وہ یہ بات سمجھ ہی نہیں سکے کہ انسان ذات کو ہمیشہ کے لئے تاریکی میں نہیں رکھا جاسکتا، ان کو یہ قطعی محسوس نہ ہوا کہ یونانیوں کو مشرقی اقوام سے جدا کر کے بالکل مغربی قوم بنانا ایک احمقانہ فعل ہے کیونکہ یونانی زبان کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ وہ ایرانی اقوام کے قریب تر ہیں اور وہ ایشیا میں رہتے ہوئے اپنے حقیقی وطن سے صرف چند سو

Marfat.com

میلوں کے فاصلے پر تھے۔ ان کی ساری اٹھان اور نشو نما یونان سے زیادہ ایشیا اور مصر میں ہوئی تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یونانی آرٹ اور فن کا وہ کونسا میدان ہے، جس میں انہوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے اور جس کا آج تک کوئی مقابلہ نہیں کرسکا ہے؟ یہاں یہ بات بغیر کسی خوف و تردد کے کہی جاسکتی ہے کہ یہ سنگ تراشی کا فن ہے، کیونکہ وہ انسانی جسم کے بارے میں خصوصی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آج تک یونانیوں کے مقابلے میں کوئی ایسی قوم پیدا نہیں ہوئی جو پتھر سے چھینی کے ذریعے خوبصورت مجسمے گھڑسکے۔ وہ فی الواقع انسانی جسم کی خوبصورتی میں جذب ہوچکے تھے۔ انہوں نے اپنے فن کے بھی عظیم شاہکار جو آنے والے نسلوں کے لئے بطور ورثے کے چھوڑے ہیں، وہ بلیوڈیئر (Apollo of Belvedere) اور مائلو کے وینس Venus کے مجسمے ہیں۔ وہ واقعی انسانی جسم کی خوبصورتی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ یہ وہ دور تھا، جب یونانی ڈیونائیس (Dionysus) کو بڑے سے بڑا دیوتا مانتے تھے۔ اور جب انگوری شراب کا جوہر انسان کے بہترین جذبات کو بھڑکانے کے لئے خاص محرک سمجھا جاتا تھا، مطلب یہ کہ اس دور میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ انسان ظاہری اشیاء کی بجائے دیگر چیزوں کی جستجو کرے۔ لیکن اقبال زوردار الفاظ میں ہماری توجہ مبذول کراتے ہوئے کہتے ہیں:

اگر بہ سینئہ ایں کائنات در نہ روی،

نگاہ را بہ تماشا گذاشتن ستم است،

اگر تو اس کائنات کے سینے میں جذب نہیں ہو گے اور نظر کو فقط تماشے کے طور پر چھوڑ دو گے تو یہ ظلم ہے۔ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے دوسری جگہ کہتے ہیں:

Marfat.com

رقص تن در گردش آرد خاک را
رقص جان برہم زند افلاک را

جسم کا ناچ محض مٹی کو گردش میں لاتا ہے، لیکن روح کا ناچ آسمان پر جنبش پیدا کر دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک ہم نے صرف یہ دکھانے کی کوشش ہے کہ اقبال کا الہام "صورت" یا ظاہری احساس کی سطح کا نہیں ہے، بلکہ وہ "نظریے" اور معنی کی مناسبت سے جنم لیتا ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کا فن "اسلامی فن" ہے، جس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ وہ ابھی تک وجود میں ہی نہیں آیا۔ یہاں فی الحال ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ اس خیال سے مصوری اور موسیقی پر کچھ بات کر سکیں، کیونکہ یہ بذات خود جدا اور مکمل موضوع ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اقبال خیالات و نظریات کو اس طریقے سے پیش کرتے ہیں، جس طرح ایک فلسفی پیش کرتا ہے؟ کیا وہ باقاعدہ ایک جگہ بیٹھ کر اپنے خیالات کا تجزیہ کرتے تھے اور ترتیب دیتے تھے؟ اور اس کے بعد ایک مفکر کی طرح بیٹھ کر اپنے نظریات تشکیل دیتے تھے؟ اگر اس طرح ہوتا تو اقبال کی شاعری ہمیں کبھی متاثر نہ کرتی اور یہ محض ناصحانہ شاعری کی حیثیت اختیار کرتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کی شاعری زیادہ تر غنائی قسم کی ہے۔ بلکہ یہ ملٹن کی اس تعریف پر پوری اترتی ہے، جس کے مطابق وہ شاعری کو جذبات کا مظہر و منبع یا جذبات کو برانگیختہ کرنے والی بتاتا ہے۔ البتہ اقبال کی شاعری ملٹن کی تعریف سے ایک لحاظ سے جدا و ممتاز بھی ہے، کیونکہ یہ حسیاتی نہیں، نظریاتی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال کی شاعری سادہ، نظریاتی، روح کو گرمانے اور وجد میں لانے والی ہے۔ جبکہ ملٹن کی شاعری سادہ مگر حسیاتی اور جذبات کو ابھارنے والی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے چند سال قبل اقبال کی شاعری کو نظریات کا

Marfat.com

عجائب گھر کہا تھا۔ اقبال موجودہ دور کے ہر نظریے کو اپنے فن کے لئے تحرک کا باعث سمجھتے اور اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ ان نظریات میں کشش محسوس کرتے اور ان کو رد عمل کے لئے ابھارنے کا سبب بھی بنتے ہیں۔ وہ نطشے جیسے فلسفی کو پڑھتے ہیں اور کچھ وقت کے لئے ان کی زبان میں بات کرتے ہیں، کیونکہ انہوں نے اس پر توجہ مبذول کی، بلکہ وہ اس حد تک آگے جاتے ہیں کہ ان کی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے وہ پرامن آدمی کو گوسفند یعنی بھیڑ کہتے ہیں۔ دوسری جگہ وہ گوئٹے سے بہت متاثر نظر آتے ہیں، بالخصوص گوئٹے کا وہ نظریہ جسے وہ "جنون" یا "آسیب زدگی" سمجھتے ہیں۔ اقبال کا شکوہ یا نیچے دیا ہوا شعر دیکھئے:

ما از خدائے گم شدہ ایم، او بجستجو است
چوں ما نیاز مند گرفتار آرزو ست

(ہم خدا سے گم گشتہ ہیں اور وہ ہماری تلاش میں ہے۔ ادہر ہم سا نیازمند خواہشات کے چکر میں گرفتار ہے)

اس قسم کے اشعار گوئٹے کے ان اشعار کا رد عمل ہیں، جو اس نے دیوتاؤں کو مخاطب ہو کر کہے تھے:

تو ہمیں اس زندگی میں لے آیا،
اس کے بعد غریب کو چھوڑ دیا تاکہ گنہگار بنے
اس کے بعد اسے دکھ درد کے حوالے کردیا
کیونکہ دھرتی سے ہر گناہ کا بدلہ لینا تھا

گوئٹے اپنے جنونی جذبہ میں آکر اسی طرح بات کرتا ہے۔ حالانکہ بچارا حافظ بھی اس حد تک بمشکل جاتا ہے:

گناہ گرچہ نہ بود دراختیار ما حافظ!
تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من است

Marfat.com

جب اقبال "لا اُحبّ الافلین" پڑھتا ہے، تو کہتا ہے کہ "تراشیدم، پرستیدم، شکستم" یعنی میں نے بھی بت گھڑا، جسے پوجا اور پھر اسے چکنا چور کردیا۔ یہاں وہ اپنی خودی میں مصروف نظر نہیں آتے اور نہ ہی یوں کہنے کا اسے خیال ہے:

خودی میں گم ہے خدا کی تلاش کر غافل!
یہی ہے تیرے لئے اب صلاحِ کار کی راہ

اس کیفیت میں وہ اپنی خودی کی تعمیر کی طرف مائل نظر نہیں آتے حالانکہ رومی اس معاملہ میں ہر وقت اپنے نفس کے ساتھ مشغول نظر آتا ہے اور کہتا ہے: "خام بُدم، پختہ شدم، سوختم" یعنی میں خام اور کچا تھا، پختہ ہونے کے بعد جل سڑ گیا۔ اب رومی کے ان الفاظ کا مقابلہ اقبال کے اس شعر میں مستعمل ان تین الفاظ سے کرتے ہیں:

ہزاراں سال با فطرت نشستم
باو پیوستہ و از خود گسستم
ولیکن سر گذشت این دو حرف است
تراشیدم، پرستیدم، شکستم

(ھزاروں برس میں فطرت کے ساتھ بیٹھا رہا۔ اپنے آپ کو اس سے متصل کیا اور اپنے آپ سے بھاگتا اور دور ہوتا رہا۔ مگر ساری کہانی ان دو حرفوں میں ختم ہوتی ہے کہ: تراش کر پوجا کی اور توڑ دیا)۔

مذکورہ کیفیت سے اقبال کے ہاں فطرت کی تلاش کے لئے ایک ایسے سائنسدان کا نظریہ جھلکتا ہے، جو فطرت کا مطالعہ "باسم ربک الذی خلق" کو ذھن نشین کیے بغیر کرتا ہے۔ اگر وہ "باسم ربک" کو ذہن نشین کرکے ایسا کرتا تو پھر فطرت کے ساتھ ہزاروں برس گذارنے کا نتیجہ یہ نہ نکلتا، کیونکہ

Marfat.com

آفاق میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

ظاہر ہے کہ اپنے آپ کو الگ رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ "فی الافاق" سے یہ مقصد پورا ہو رہا تھا۔ اس وقت ان کی کیفیت بالکل "لا" والی تھی نہ کہ "الا" والی۔ لیکن اگر وہ اپنے مطالعہ کی ابتدا "باسم ربک" سے کرتا، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں تو پھر وہ "لا" سے خود بخود "الا" کے مقام پر آجاتا۔ یہ بات اس حقیقت کا زیادہ ثبوت پیش کرتی ہے کہ شاعر شعوری طو پر مطالعہ نہیں کرتا، بلکہ یہ اس کے مزاج یا اس پر حاوی کیفیت پر منحصر ہے، جس کی رہنمائی میں وہ آگے بڑھتا ہے۔ ہوا کا جھونکا اسی جگہ زور سے لگتا ہے، جہاں اس کا امکان ہوتا ہے۔ جو شخص فقط الزام لگاتا ہے وہ غلط ہے اور وہ آدمی بھی غلط ہے، جو زیادہ ملنے کی امید کرتا ہے۔ شاعر صرف شاعر ہے، فلسفی اور مفکر نہیں۔ کتنے ہی خیالات اور نظریات ہیجان پیدا کرتے رہتے ہیں اور اسی طرح شاعر بھی ردعمل کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں نظریات اور محسوسات ترغیب دلانے والے اور عامل ہیں۔

یہی بات شیکسپیئر کے بارے میں کہی جاسکتی ہے، جو ایک بڑا شاعر ہے۔ ان کی قوم کے لوگ صدیوں سے ان کی آراء اور خیالات کی تلاش میں ہیں، مگر اقبال کے مقابلے میں وہاں بھی زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ "الڈس ہکسلے" شیکسپیئر کے بارے میں اپنا تجربہ یوں بیان کرتا ہے:

> "اگر آپ سب باتیں کہنا چاہیں تو وہ ایک دوسرے کو رد کریں گی اور نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ چنانچہ شیکسپیئر کا کوئی واضح فلسفہ دریافت نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن دیکھا جائے تو اس کے مابعد الطبعیات فلسفہ میں حسن اور خوبصورتی کا ایک نظام ہے۔ ایسی سچائیاں بھی ہیں جو ایک شاعر اپنے تعلق کی

Marfat.com

بنا پر نظاروں اور لکھی ہوئی سطور میں بیان کرتا ہے۔ اس لحاظ
سے اس کے ڈراموں میں الٰہیاتی رنگ بھی نمایاں نظر آتا
ہے، لیکن اگر آپ ان منفی باتوں کو چن کر نظر انداز کریں،
جو ایک دوسرے کی تردید کا باعث بنتی ہیں، تو پھر آپ کو
ایسے غیر معمولی اقوال ملیں گے جن میں دانائی واضح نظر
آئے گی۔"

آخر میں مجھے یہ تقریر ان الفاظ پر ختم کرنے کی اجازت دیں کہ جب تک یہ برسیاں کسی واضح مقصد کو سامنے رکھ کر نہیں منائی جاتیں، تب تک یہ بے فائدہ ہیں اور ہمیں کسی منزل پر نہیں پہنچا سکتیں۔ آئیے! انہیں صحیح معنیٰ میں اسلامی بنائیں اور یہ اسلامی اسی وقت بن سکتی ہیں جب ان کے مقاصد کا علم ہو۔ کیونکہ اسلام ایک حد تک "صورت" یا "ظاہر" کا استعمال کرتا ہے۔ دراصل اسلام اسے عمیق حقیقت کا مظہر یا علامت قرار دیتا ہے۔ جب تک اس کی اصل روح کی نشاندھی نہیں کی جاتی، اور جب تک اس کے اصل مقاصد کو حاصل نہیں کیا جاتا، اس وقت تک یہ محض ایک تماشہ کی حیثیت رکھتی ہیں، جو اسلام میں ایک قسم کی بت پرستی ہے اور اسلام نے اس سے منع کیا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

حیات چیست؟ جہان را اسیر جان کردن
تو خود اسیر، جہان را کجا توانی کرد

حیاتی کیا ہے؟ دنیا کو اپنے قبضہ میں لانا۔ مگر تم تو خود قیدی ہو، جہاں کو کیسے قید کر سکو گے؟۔

جب تک ان برسیوں کا مقصد نمائش ہے، تو یہ "شرک" ہے۔ یہ فقط اس وقت اسلامی ہو سکتی ہیں، جب ان کی اصل روح کو تلاش کرنے اور اسے اپنانے کی کوشش کی جائے۔

Marfat.com

میں شروع میں ذکر کر چکا ہوں کہ میرے یہاں آنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اسلامی ریاست میں سائنس، فلسفہ اور آرٹ کے صحیح مقام اور حیثیت کی وضاحت کر سکوں۔ اگر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو پھر یہ ضروری ہے کہ ان مسائل کے بارے میں صحیح موقف اختیار کریں، ورنہ بقول ایک مشہور انگریز شاعر کے، ہر تباہی کے اوپر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ "اب وقت نکل چکا"۔ ہو سکتا ہے کہ اس بار یوم اقبال کے موقعہ پر ہم میں سے کچھ لوگ اس اسلامی ملک کو صحیح معنیٰ میں اسلامی بنانے کا عزم کریں، اس کے لئے ہمیں بنیادی نوعیت کی اہم چیزوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اپنے اندر بھی حتّٰی یغیّروا ما بانفسھم (یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کریں) کا احساس پیدا کرنا ہوگا، تبھی جا کر ہم اپنی نشاۃ ثانیہ کے لئے راہ ہموار کر سکیں گے۔

اے چشم جہاں بیں! بہ تماشائے جہاں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اے جہاں کو دیکھنے والی آنکھ، اب دنیا کے تماشہ کو چھوڑ دے۔ اس گہری نیند کو چھوڑ دے اور اٹھ۔

Marfat.com

# شاہ عبداللطیف کی شاعری اور فن

(علامہ صاحب کا یہ تفصیلی مقالہ سب سے پہلے سال ۱۹۶۱ع میں سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے شائع ہوا)

آج کا دور بین الاقوامیت کا دعویدار ہے اور اس میں کوئی تعجب خیز بات بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ نظریہ دینی خواہ قانونی حیثیت سے چودہ سو سال پہلے متعارف کرایا گیا تھا، مگر اس کے باوجود ہم آج تک پکے قوم پرست ہیں۔ ظلم تو یہ ہے کہ خود دین اور قرآن کو بھی قوم پرستی اور نظریہ قومیت میں تبدیل کردیا گیا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ہر معاملے میں "میرا" اور "تیرا" کا خیال بالا اور نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر ایک اپنے اپنے شاعروں پر فخر کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی خرابی نہیں، بشرطیکہ "اپنے" کو چمکانے کی خاطر "دوسرے" کی تنقیص نہ کی جائے۔ بہرحال حسن کا صحیح ذوق اب تک غائب ہے، کیونکہ حسن کی تعریف اس لئے نہیں ہوا کرتی کہ وہ حسین ہے، بلکہ اس لئے کی جاتی ہے کہ "یہ چیز میری ہے"۔ اس بنا پر شاہ عبداللطیف کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کرنے کے لئے ہم انہیں کسی ایسی کسوٹی پر پرکھنا نہیں چاہتے، جسے ہمارا اپنا دل چاہتا ہو، بلکہ اس کے لئے ہم وہ معیار مقرر کرنا چاہتے ہیں، جو جدید دنیا نے قائم کیا ہے اور جو موجودہ ادبی دنیا میں مروج اور مسلم ہے۔

**پہلا معیار:**

آج سے ایک سو سال قبل کارلائل نے نظم کو چھوڑکر نثر نویسی کو اپنایا اور ببانگ دہل کہا کہ اگر وید، بائبل اور قرآن نثر میں ہیں تو پھر ان کے لئے بھی یہی بہتر ہے۔ البتہ نظم نویسی کے فائدے کے لئے اتنا ضرور کہا کہ اگر آپ کی

نظم کو گایا نہیں جاسکتا تو پھر اسے شعر ہرگز نہیں کہا جاسکتا اور اس کا لکھنا بیکار ہے۔

اب آئیے دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کو اس کسوٹی پر پرکھیں ہیں، قطع نظر اس امر سے کہ وہ شیکسپیئر ہوں، ملٹن ہوں، گوئٹے ہوں، یا ڈانٹے اور وٹمئن۔ پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خود بھی اس معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں؟

لیکن قبل اس کے کہ ہم اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کریں، آئیے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کیا شعر کا ہر مصرعہ خود ان ملکوں میں گایا جاتا ہے؟ اس سلسلے میں ہمیں یہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ آیا اس وقت ان کا کلام گایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ممکن ہے، نئی روشنی کے کوئی صاحب ہنس کر کہدیں کہ مذکورہ شاعروں کی ساری شاعری غنائی تو نہیں، بلکہ ان کی شاعری ایسے بہت سے عنوانات پر مشتمل ہے جس کے گانے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کارلائل کو یہ معلوم تھا، مگر اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ خوبی اس نام نہاد غنائی شاعری میں بھی نہیں تھی۔ یعنی وہ بھی موسیقیت سے خالی تھی اور اس کے علاوہ اس طرح کے بڑے شاعروں کے غنائیہ اشعار میں یہ "خیال" تو موجود تھا، مگر احساس کا کوئی وجود نہ تھا۔ البتہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری میں یہ خاص خوبی ہے کہ انہوں نے کسی "خیال یا تصور" کو شعوری طور پر موضوع بنا کر ایک مصرعہ تک تخلیق نہیں کیا ہے۔ بلکہ ان کی ساری شاعری گہرے جذبات اور احساسات سے بن کر ابھر کر نکلی ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنے ابیات کو کبھی کارنامہ قرار نہیں دیا، کیونکہ انہیں اس کے لئے کوئی خاص محنت اور کاوش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ انہوں نے یہ ابیات ایسی وجدانی کیفیت میں کہے ہیں، جس میں انہیں زیادہ

Marfat.com

کاوش درکار نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی شاعری کو "رسالہ" یعنی پیغام بھی کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کوشش کے بغیر ان کے اشعار کو ہر سطر گایا جارہا ہے۔ ان گانے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو ان کے کلام کو سمجھتے ہیں اور وہ بھی جو ان کے کلام کو کچھ زیادہ نہیں سمجھ سکے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا کلام گایا جارہا ہے اور لوگوں کو اس سے روکا بھی نہیں جاسکتا۔ یہ بات کارلائل کے مذکورہ نظریے کی مکمل تائید و تصدیق پیش کررہی ہے، جو کہتے ہیں کہ بیشک شعر وہ ہے جسے ہر آدمی پڑھنے کی بجائے گنگناتا ہے، کیونکہ اس میں موسیقی کی شان پائی جاتی ہے۔ ایک عرب مصنف نے شاعری کو الفاظ کا ہم آہنگ تکرار یا راگ بتایا ہے اور موسیقی یا راگ کو آوازوں کی ہم آہنگی قرار دیتا ہے۔ وہ اصرار کے ساتھ کہتا ہے کہ ہر مصرعہ میں ترنم کی خصوصیت کا ہونا شعر کا لازمی جزو ہے۔ الغرض یہی وہ اولین مانی ہوئی کسوٹی ہے، جس پر ہر بڑے شاعر کو پرکھا جاسکتا ہے اور فرد یہ کسوٹی استعمال کرکے از خود نتیجہ اخذ کرسکتا ہے۔

یہاں کوئی صاحب یہ سوال اٹھاسکتے ہیں کہ شاعر کے کلام کی کثرت اور ضخامت بھی تو اہم چیز ہے۔ جی ہاں بالکل! اس سلسلے میں بھی شاہ عبداللطیف کی شاعری کا ذخیرہ دنیا کے اکثر بڑے بڑے شعراء کی بنسبت کہیں بڑھ کر ہے۔ ان کے کلام میں کم و بیش تیس ڈرامائی واقعات بیان شدہ ہیں۔ اس لحاظ سے سوائے شیکسپیئر اور گوئٹے کے بمشکل کوئی شاعر ان کی صف میں آسکتا ہے۔

## دوسرا معیار:

دوسرا معیار جو جدید دور کے نقاد کے نزدیک اہم ہے، یہ ہے کہ کیا شاعر کے کلام کے کسی مصرعہ میں لفظی تغیر لایا جاسکتا ہے، جس کی وجہ سے اس مصرعہ کو زیادہ فصیح اور مؤثر بنایا جاسکے اور اس میں مزید حسن پیدا کیا جاسکے۔ ایک بار جب بین جانسن سے پوچھا گیا کہ آپ اپنے شعر کی دس بار یا اس سے بھی زائد بار تصحیح

Marfat.com

کرتے ہیں، حالانکہ شیکسپیئر نے کبھی اپنی شاعری کی دوبارہ اصلاح نہیں کی، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ میرے خیال میں بہتر ہوتا اگر شیکسپیئر اپنے اشعار کی بیس بار اصلاح کرتا۔ مگر زمانہ شاہد ہے کہ ان کی وہ تخلیقات جن کی دس بار اصلاح کی گئی، اس میں ابھی اصلاح کی گنجائش باقی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس شیکسپیئر کی فی البدیہہ شاعری اصلاح سے ماوریٰ ہے۔ اور اس میں اکثر و بیشتر اشعار اور نظمیں ایسی ہیں کہ ان میں ایک لفظ کی تبدیلی بھی سارے مصرعہ کے حسن کو تلپٹ کردے گی۔ بہت کم شعراء ہیں، جن کا کلام اس معیار پر پورا اتر سکتا ہے۔ مگر شاہ عبداللطیف کے کلام میں ایک لفظ کی تبدیلی بھی پورے ترنم کو بگاڑ دے گی، بلکہ اسے ختم کردے گی یا یوں کہا جائے کہ اسے ناقابل برداشت ٹھہرائے گی۔ غرض یہ کہ شاہ عبداللطیف کی شاعری کے ایک لفظ کو بھی تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات شاہ صاحب کی پوری شاعری پر صادق آتی ہے۔ نہ صرف ان کی شاعری کا ہر مصرعہ بلکہ ہر لفظ اور اس کی ساخت کی خصوصی اہمیت ہے، جسے بدلنا ناممکن ہے۔

دنیا کا کوئی شاعر اپنے پورے مجموعہ کلام کے اعتبار سے اس کسوٹی پر بمشکل پورا اتر سکتا ہے۔ دوسرے شعراء کو چھوڑئیے، خود شیکسپیئر کے بہت سے اشعار میں ترمیم کرنے کے بعد اسے زیادہ بہتر سمجھا گیا ہے۔ یہ دوسرا معیار تھا جسے دور جدید کے نقاد کسی بھی شاعر کی اہلیت کو پرکھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ دونوں معیار ایسے ہیں جو نئی دنیا کے بڑے بڑے شعراء کا معیار مقرر و متعین کرنے کے لئے کافی ہیں۔

## تیسرا معیار:

اب تیسرا اور نہایت اہم معیار جسے فنی تنقید کے لحاظ سے بھی قطعی قرار دیا گیا ہے، وہ ہے زبان کا استعمال، یعنی جس زبان کے ذریعے شاعر اپنے خیالات

Marfat.com

کا اظہار کرتا ہے۔ ملٹن کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے انگریزی کے آٹھ ہزار الفاظ اور شیکسپیئر نے سولہ ہزار الفاظ استعمال کیے ہیں۔ الفاظ کی ترکیب اور موزون استعمال کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو خیالات کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ مگر اس معیار کو اس طرح استعمال کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

اصل سوال یہ ہے کہ سولھویں صدی کی انگریزی زبان میں خیالات کے اظہار کی جو وسعت شیکسپیئر نے پیدا کی تھی، کیا اس سے بڑھ کر وسعت پیدا کرنے کا امکان موجود تھا؟ بالفاظ دگر معیار ہے خیالات کے اظہار کے لئے اس زبان میں زیادہ سے زیادہ وسعت پیدا کرنا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ملکہ الزبتھ کے زمانے میں شیکسپیئر کے سوا کسی شخص میں نہ حوصلہ تھا اور نہ ہی اس کے خواب وخیال میں یہ بات آسکتی تھی کہ انگریزی زبان کا اس طرح بھی استعمال ہوسکتا ہے، جس طرح شیکسپیئر نے کیا تھا۔ یہی بات گوئٹے اور ڈانٹے کے لئے کہی جاسکتی ہے، اس کے باوجود وہ دونوں اس کمال پر نہیں پہنچے، جہاں شیکسپیئر یا ہمارے شاہ عبدالطیف بھٹائی پہنچے ہیں۔

دراصل یہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی برکت ہے کہ اٹھارویں صدی میں سندھی زبان نے اتنی وسعت اور جامعیت اختیار کرلی تھی، یہاں تک کہ یہ باور کرنا مشکل تھا کہ یہ وہی زبان ہے جو عام طور پر اس دور میں سندھ میں بولی جاتی تھی؟ سندھی زبان جو اس وقت ایک محاورہ یا لہجہ کی حیثیت رکھتی تھی، جب شاہ عبداللطیف بھٹائی کے پاس آئی تو نہایت گراں مایہ اور وسیع ترین زبان بن گئی۔ یہاں تک کہ ہم مشکل سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہی علاقائی لہجہ والی زبان ہے۔ یہاں ہمیں کارلائل کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں جو انہوں نے رابرٹ برنس کی اسکاچ زبان کے بارے میں استعمال کئے تھے:

Marfat.com

"بیچارہ برنس (Burns) ہر طرح سے خسارہ میں نظر آتا ہے۔ غیر تربیت یافتہ اور غریب جو شاید پیدا ہی سخت محنت کرنے کے لئے ہوا تھا۔ مگر وہ لکھنے پر آمادہ ہوا تو اس نے دیہات کی اس مخصوص زبان میں لکھنا شروع کیا، جو صرف اس علاقے تک محدود تھی، جہاں وہ پیدا ہوا اور اس کی نشونما ہوئی تھی۔ مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ یہ سب کچھ انگلستان کی زبان میں لکھتا تو یقینا وہ عالمی سطح کے بڑے آدمی کی حیثیت سے پہچانا جاتا، کیونکہ اس کے اندر وہ ساری خوبیاں موجود تھیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج بہت سے لوگ اس دیہاتی اور بے مزہ زبان پر فدا ہیں اور اسے دل سے عزیز رکھتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے اندر بعض غیر معمولی خوبیاں موجود ہیں۔"

بہرحال یہاں کارلائل یہ نہیں کہتا کہ برنس اسکاچ نے لہجہ اور محاورہ کی اس طرح صورت تبدیل کی کہ نہ تو اس سے پہلے کسی نے ایسا کیا اور نہ بعد میں کوئی اس طرح کرسکا۔ البتہ شیکسپیئر کسی حد تک نمایاں و منفرد مقام کا حامل ہے، کیونکہ اس کی استعمال کردہ زبان کی نہ نقل ہوسکی ہے اور نہ ہی گذشتہ چار صدیوں میں کوئی شخص ایسی کوئی مثال قائم کرسکا ہے۔

دراصل پروفیسر گب نے قرآن شریف کے بارے میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں، معمولی تبدیلی کے ساتھ وہ الفاظ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے رسالے پر بھی صادق آتے ہیں۔ گب نے پہلے تو کارلائل سے قرآن شریف کے انداز بیان کے متعلق اختلاف کیا ہے اور ویسے بھی کارلائل کو عربی نہیں آتی تھی، جبکہ گب زندگی بھر عربی کے استاد رہے، انہیں عرب ممالک میں عربی زبان کے لئے ایک

Marfat.com

سند تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ:

"ادبی خوبیوں کا تعین صرف قیاسی یا نظریاتی بنیادوں پر نہیں ہو سکتا، بلکہ اس سلسلے میں عربی زبان کی فطری اور سماجی خصوصیات کو بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔ گذشتہ پندرہ سو سالوں کے دوران انہی ہتھیاروں کے ذریعے جس قوت اور شدت یا جس اثرانگیزی کی حد تک محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کا استعمال کیا، کوئی اور نہ کرسکا"۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سندھی زبان کا اس طرح استعمال کیا، جس طرح نہ تو کوئی پہلے کرسکا تھا اور نہ بعد کی دو صدیوں تک کوئی کرسکا۔ اس نکتہ پر زیادہ بحث کرنے کی بجائے اب ہم چوتھے معیار کی طرف آتے ہیں اور وہ ہے موضوع کا انتخاب اور اسے نبھانے کا طریقہ۔

## موضوع کا انتخاب:

موضوع کا انتخاب اور اسے نبھانے کا انداز بھی کسی شاعر کے مقام ومرتبہ کے تعین اور دیگر شعراء سے اس کا ممتاز ہونے کے لئے بہت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ انتخاب سے ہمارا مقصود، شعور یا ارادہ کا انتخاب نہیں، کیونکہ ایک فنکار پر موضوع اکثر لاشعوری طور پر وارد ہوتا ہے اور وہ اسے تحرک میں لاتا ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ انسانی ارتقا کے مختلف مراحل میں مختلف موضوعات نے فنکاروں کو اپنی طرف راغب کیا ہے۔ اس لئے مختلف طریقے اور ماڈل وجود میں آئے ہیں۔ مثلاً لفظ ارتقا صدیوں سے سننے میں آرہا ہے، مگر بہت کم لوگ اس کے معنی اور مفھوم کو سمجھتے ہیں، بلکہ مذھبی تشدد، عداوت اور جنگجویانہ وطن پرستی وغیرہ اسے سمجھنے میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ ورنہ عقل کا تقاضا ہے کہ فنون لطیفہ جو خاص

طور پر انسانی ارتقا کی نشاندہی کرتے ہیں، ان کا مطالعہ اس اعتبار سے ہونا چاہیئے تھا۔ اس کا فطری ارتقا لازمی طور پر انسانی ارتقا کے ساتھ ہوا ہے۔ قوموں، قبیلوں اور ملکوں میں جہاں جہاں نئے اقدار وجود میں آئے، وہاں پہلے فنون لطیفہ نے جنم لیا ہے۔ الہام بھی یہی طریقہ اختیار کرتا ہے، بلکہ انسان کا اپنا اندرونی احساس ہی الہام کا تعین کرتا ہے۔ مگر کسی بھی انسان کو کسی ایسی چیز کے بارے میں الہام نہیں ہوتا، جس کا اسے کوئی احساس ہی نہ ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ احساسات کو فنون لطیفہ میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔

آئیے ایک مثال سے اسے واضح کریں۔ ایک وقت تھا جب انسان اپنی برادری کے دیگر افراد کی طرح تھا۔ اسے صرف اپنی بنیادی ضروریات کی چیزوں سے دلچسپی تھی، اور ان ضروریات کی تکمیل کی اسے صلاحیت حاصل تھی۔ اس وقت فطری طور پر اس کے احساسات ان ہی مسائل سے متعلق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف دستکاری بلکہ غاروں میں کی ہوئی مصوری نے بھی آہستہ آہستہ ان ضروریات سے جنم لیا۔ بہرحال ہزاروں برس بعد بھی انسان کی تخلیقی صلاحیت اور الہام اس حد کو پہنچے ہیں، جنہیں اب ہم فنون لطیفہ کا نام دیتے ہیں۔ انسان نے اپنا جھونپڑا صرف اس لئے بنایا، تاکہ وہ اپنے آپ کو دھوپ سے بچا سکے۔ اس وقت اس کے خواب میں بھی نہ تھا کہ اس کی اس معمولی کوشش کی بنا پر، جس کا مقصود خود کو سورج کی تمازت سے بچانا ہے، ایک دن عمارت سازی (Archittecture) کا فن وجود میں آئے گا۔

تمام فنون لطیفہ کی یہی کہانی ہے۔ یہ فنون جتنے مقصدی نوعیت کے ہیں اتنا ہی ان کے رونما ہونے میں وقت صرف ہوا ہے۔ اس لئے ہم نہ صرف فن سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ انسان ارتقا کے کس مرحلے میں ہے؟ بلکہ اس طریقے سے یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ اس مخصوص مرحلے پر کون سی چیزیں اور عناصر

اس کی تخلیق کے لئے الہام کا باعث بن سکتی ہیں۔

ابتدائی دور میں فن جنسی جذبے سے تعلق رکھتا تھا، بلکہ اسی کی پیداوار ہے۔ اس مرحلہ پر اس کی حیثیت دستکاریوں کی طرح زیادہ تر افادی نوعیت کی تھی نہ کہ تخلیقی نوعیت کی۔ کافی عرصہ تک یہی کیفیت رہی اور اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی۔ اس طرح بہت عرصہ گذر جانے کے بعد کہیں جاکر ایک انسان دوسرے میں محض انسان ہونے کی وجہ سے دلچسپی لینے لگا، یہ کیفیت کافی عرصہ تک قائم رہی، یہاں تک کہ کوئی دوسری فطری چیز، جس کا باقاعدہ انسانی وجود سے تعلق ہو، اس کے مشاہدہ میں آئی، پھر اس کے لئے الہام کا باعث بننا شروع ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ فطری شاعری (Natural Poetry) فن شاعری میں سب سے آخر میں وجود میں آئی۔

ہاں! مگر یہ بات ہمیں پھر وہیں واپس لے آئی، جہاں سے ہم نے ابتدا کی تھی: یعنی انسان مختلف اوقات میں مختلف چیزوں سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا دارومدار اس کی ارتقائی سطح پر ہے۔ یہ کوئی پرانی بات نہیں ہے۔ تقریباً ہمارے ہی زمانے میں بائرن، ورڈس ورتھ اور ان کے ہم عصر شعراء کو اس لئے تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا اس لئے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے لئے غیر اہم چیزوں کو موضوع کے طور بنایا تھا۔ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان نہ تو برنس (Burns) کا موزی (Mousie) پھول بنا اور نہ ہی ورڈس ورتھ کا (Daisy) اس کی تسکین اور ٹھنڈک کا سبب بنا۔ یہ بات بھی معیوب سمجھی جاتی تھی کہ پرانے قصوں کو شاعری کا موضوع بنایا جائے، بلکہ ہر شاعر کے لئے ضروری تھا کہ وہ پلاٹ بھی اپنا تخلیق کرے۔

بہر حال جب تک قرآن شریف نازل نہیں ہوا تھا، اس وقت تک ہر قدیم واقعہ کو پرانا کہکر نظر انداز کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کی بعض سورتوں

Marfat.com

کے عجیب و غریب قصے، جو ایسی چیزوں سے متعلق تھے، وہ اور زیادہ متاثر کن ثابت ہوئے۔

قرآن شریف نے نہ صرف ان چیزوں کا ذکر کیا، بلکہ ان چیزوں کو اہمیت بھی دی، جو غیر اہم تھیں حالانکہ اس سے پہلے یہ چیزیں قابل نفرت سمجھی جاتی تھیں، مثلاً: عنکبوت، شہد کی مکھی، چیونٹی، گائے وغیرہ۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ چہ میگوئی بہت کم وقت چلی، بلکہ اس کے بعد انسانوں کی بڑی تعداد نے قرآن شریف کی اس تحریک کو قبول کرلیا اور اس کی اتباع کی۔ یوں اس کے بعد یہ پرانے قصے اور فطرت کی یہ معمولی معمولی چیزیں، نہ صرف شعراء بلکہ سائنسدانوں کے لئے بھی دلچسپی کا باعث بن گئیں یا یوں کہئے کہ چیونٹی، شہد کی مکھی اور عنکبوت جیسی چیزوں کا شعوری اور ارادتی مطالعہ وقت کی ضرورت بن گیا، اور صدیوں تک ایک محبوب مشغلہ کی صورت اختیار کر گیا۔ یورپ میں ڈارون، مائٹرلنک، (MaeterLink) اور ایوبری (Avebury) کی طرح کیسے بڑے سائنسدانوں نے اس اشارے کو سمجھا اور پھر چھوٹے چھوٹے حشرات کا مطالعہ کر کے صدیوں تک انسان ذات کو فائدہ پہنچایا۔ آخر وہ ایسا کیوں نہ کرتے؟ خود قرآن شریف میں چیونٹی کو عظیم پیغمبر حضرت سلیمان اور اس کے ساتھیوں پر طنز کرتے ہوئے بتایا گیا ہے۔

باقی جہاں تک قدیم قصوں کا تعلق ہے، تو یورپی ممالک کے بہت سے شعراء نے اس بات کو نقل کیا ہے، خواہ ڈانٹے ہو یا ملٹن، شیکسپیئر ہو یا گوئٹے! شیکسپیئر نے تو یورپ کے سارے مروج قصوں کو اپنے ڈراموں میں استعمال کیا ہے اور جب وہ قصے ختم ہوگئے تو اپنے ملک کی تاریخ کو ڈرامہ نگاری کے لئے منتخب کیا۔ بہر صورت وہ نئے قصے لکھنے سے پرہیز کرتا ہے۔

گوئٹے کے اہم ڈرامے نہ صرف پرانے ہیں، بلکہ وہ پہلے بھی ڈرامائی شکل

Marfat.com

میں پیش ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر فاسٹس کی کہانی اس سے پہلے مارلو (Marlow) ڈرامے کی شکل میں پیش کر چکا تھا اور اسی طرح افیجینا کو ایک یونانی ڈرامہ نگار ڈرامائی شکل دے چکا تھا۔ گوئٹے نے دونوں ڈراموں کو ازسر نو ڈرامائی شکل دی۔ ایک عام آدمی کو یہ ادبی چوری معلوم ہوتی ہے، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ مارلو کے فاسٹس اور گوئٹے کے فاسٹس میں کتنا فرق ہے۔

اسی طرح یورپڈیس (Euripides) کی افجینا گوئٹے کی افجینا سے بالکل جداگانہ ہے۔ بعینہ ملٹن کی "جنت گم گشتہ" (Paradise Lost) عہد نامہ عتیق کی ایک پرانی کہانی ہے، جسے نظم کا لباس پہنایا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں شیطان سچ مچ "جنت گم گشتہ" کا ہیرو ہے۔

الغرض یہ سب پرانی کہانیاں ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا انہوں نے صرف پرانی کہانیوں کو دہرایا ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ معنیٰ و مفہوم کے ساتھ ساتھ نقطۂ نظر اور بنیادی مقصد بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا کہ قالب ایک ہے، مگر ان کی روح اور مقصد بلکل جدا ہے۔

الغرض فنون لطیفہ کا ارتقاء ہمیں بتاتا ہے کہ جوں جوں فن ترقی کرتا ہے، اسی طرح چیز کی مادی اور خارجی اہمیت، بالفاظ دیگر اس کی مادی حیثیت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ گویا نئے پلاٹ کو تخلیق کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور فنکار کے لئے پرانہ قصہ یا کہانی الہام کا باعث بن سکتا ہے اور تخلیق کے لئے اسے ابھار سکتا ہے۔

اس سلسلے کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ فنکار اس چیز کی مادی صورت کی صنعتگری کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور نہ ہی اس قصے کو تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہے، بلکہ وہ صرف اس کے معانی اور مفہوم سے سروکار رکھتا ہے، اور اس کے آرٹ یا تہہ تک پہنچنا چاہتا ہے۔

Marfat.com

اب جہاں تک موضوع کے انتخاب کا سوال ہے۔ سرزمین سندھ کا یہ عظیم شاعر قرآن مجید کی تعلیمات کے ساتھ بالکل اس طرح ساتھ ساتھ چلتا ہے، جس طرح ان سے پہلے یا بعد والے شعراء حضرات ساتھ چلے ہیں۔ وہ شیکسپیئر کی طرح اس دھرتی کے کسی اہم قصے اور کہانی کے کسی معنیٰ خیز پہلو کو لے کر اسے شاعری کا لباس پہنا کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ البتہ جہاں تک مادی اشیاء کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں انہیں جو چیز بھی راہ چلتے ملتی ہے، وہ اسے سینے سے لگاتا ہے، خواہ وہ سوکھا پتہ یا ہنس پرندہ ہی کیوں نہ ہو۔ آسمان پر چھایا ہوا بادل ہو یا پہاڑی علاقوں میں صحرانوردی کرنے والا کوئی جوگی۔ وہ بھول کر بھی یہ تصور نہیں کرتے کہ وہ کوئی نیا پلاٹ تیار کرتے ہیں یا ایسی کوئی خاص چیز ڈھونڈھ کر اسے اپنی شاعری کا موضوع بنا رہے ہیں، جو بذات خود حسین اور خوبصورت ہے اور کسی چیز کا مادی یا ظاہری پہلو اسے مشکل نہیں لگتا۔ کسی چیز کا معنوی پہلو ہی اس کے لئے الہام کا باعث بنتا ہے اور وہ اسے بیان کرتا ہے۔ اس چیز کو واضح کرنے کے بعد ہی ہم کسی فنکار کے نقطہ نظر یا اس کے مرتبہ اور حیثیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے بیسویں صدی کے نصف اول کے ایک ایسے ادیب کی گواہی پیش کرنا چاہتے ہیں، جسے بجاطور پر مغرب کا عارف کہا جا سکتا ہے۔ وہ ہے ہرمن فان کیسرلنگ (Hermann Van Keyserling) وہ پرانے قصوں اور ان کی اہمیت کے متعلق کہتا ہے: "آخر اتنی بڑی بڑی ایجادات انسان کی اپنی ترقی کے نقطہ نظر سے اتنی کم اہمیت کی حامل کیوں ہیں؟۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حقائق کی اصل اہمیت کا سارا دارومدار ان کے روحانی تعلقات پر مبنی ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایجادات کے نقطہ نظر سے خالی کیفیات نے بالآخر دنیا کو کس طرح تبدیل کیا؟۔ ان سب چیزوں کا سبب اندر کی دنیا سے پیدا ہونے والا وہ احساس ہے جو ممکن معنوی اہمییت کا

Marfat.com

تعین کرتا ہے۔ لیکن اگر اندرونی ہم آہنگی کا بنیاد پہلے سے ہی گہرا نہ ہو تو پھر نئے حقائق بھی زندگی کے مقصد کو کوئی جدت نہیں دے سکتے۔ اگر اندرونی ہم آہنگی پہلے ہی زیادہ ہو تو پرانے سے پرانے واقعات بھی نئے مفہوم کے حامل بنتے ہیں۔
یہ آخری حقیقت اپنی جگہ نہایت اہم ہے، بلکہ ٹھیک اسی وجہ سے تاریخ میں جو بھی عظیم لوگ تھے، وہ جدت کے مخالف تھے۔ یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ پھر تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اثر پرستی صحیح معنی میں ارتقا سے ہم آہنگ ہے، البتہ شکل وصورت سے اس کا بہت کم تعلق ہے۔

اس سوال کا جواب ہاں میں ہے، کیونکہ اب تک یہی ہوتا آرہا ہے، مگر پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فنی شہہ پاروں سے کسی دوسری چیز کا اظہار ہو سکتا ہے؟۔ مثلا: معنی یا مفہوم۔ ایسا مفہوم جو یقینی معنیٰ سے اعلی ہو، کیا اس سے کسی ایسی چیز کا اظہار ہوتا ہے، جو ہمیں اس طرح حرکت میں لائے جس طرح ایک خوبصورت اور حسین چیز متاثر کرتی ہے۔
ہاں! مگر اس کا اس طرح غلط مطلب نہیں لینا چاہئے کہ اس کی بیرونی شکل اورصورت کو ہی اصل مقصد قرار دیا جائے بلکہ اسے ہی سب کچھ سمجھا جائے۔

## نقطہ نظر (View-Point)

موضوع کا انتخاب ہمیں فنکار کے نقطہ نظر کی طرف لے جاتا ہے۔ مگر یہاں پھر موضوع بدل کر مقصد اور فنکار خود موضوع بن جاتا ہے۔ اس صورت حال میں مقصد کا مشاہدہ اس کے لئے الہام کا سبب بنتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ آنکھ صرف وہ دیکھتی ہے جسے وہ جانتی ہے۔ ہم اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ "آدمی صرف اس چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے، جس میں دلچسپی لیتا ہے"۔
دلچسپی کا دارومدار بھی نقطہ نظر پر ہے اور کسی بھی فنکار کا نقطہ نظر دراصل اس کی فکری سطح سے وابستہ ہے۔

Marfat.com

مقصد یہ ہے کہ ایک ہی چیز کا مشاہدہ کرنا، یہ ہر فنکار کے لئے اہمیت (Significance) کے اعتبار سے جدا جدا ہوتا ہے۔ اس سے یہ عمومی نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ فن کا مطلب "اہمیت" کو سمجھنا اور پرکھنا ہے۔ لیکن یہاں اس بات کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا جاتا کہ ہر فنکار کی اہمیت یکساں نہیں ہوتی، بلکہ ہر فنکار اپنی اپنی سطح کے مطابق اپنی اہمیت کا مفہوم سمجھتا ہے۔ مثلاً جب ہم لفظ "دنیا" بولتے ہیں تو اس کا مفہوم سب کے لئے ایک جیسا نہیں ہوتا۔ بیچارے گرچیف کی بھی یہی رائے ہے، یہ بات صرف لفظ "دنیا" کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر نظارہ، ہر آواز، ہر ذائقہ اور سونگنے کی ہر چیز میں یہی اصول کارفرما ہے۔ ان چیزوں میں ہر ایک کے لئے مختلف معانی، مختلف مفہوم، مختلف یادگیری اور مختلف اہمیت ہوتی ہے، یہ بات سارے تخلیقی ذہنوں پر صادق آتی ہے۔

اس مسئلے کو زیادہ آسان انداز میں سمجھانے کی خاطر ہم ہر فنی تخلیق کی سطح اور کیفیت کو جاننے کے لئے کچھ دوسرے پیمانے اور معیار مقرر کرتے ہیں، جن کے ذریعے ان کو جانچا پرکھا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فنی تخلیق میں وحدت موجود ہے؟ ایک بار ہمیں اس سوال کا جواب مل جائے تو پھر ہم ہر چیز کی طرح اس کا سہ طرفی پھیلاؤ معلوم کرسکتے ہیں، یعنی اس کی وسعت، گہرائی اور بلندی کو پرکھ سکتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضوع اتنا دقیق ہے اور اس سلسلے میں کام اتنا کم ہوا ہے کہ اس کے بارے میں زیادہ گفتگو نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ دراصل آرٹ یا فن پر گذشتہ صدی میں اتنی زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں کہ شاید ہی کسی موضوع پر اتنا زیادہ لکھا گیا ہو، ایسی کتابوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ یہاں ہم ان کا اختصار دینا بھی نہیں چاہتے۔ کیونکہ اگر ایسا کر بھی لیں تو بھی قارئین کسی ٹھوس اور منطقی نتیجہ پر پہنچ نہیں سکیں گے،

Marfat.com

بلکہ ٹومک ٹائیاں مارتے پھیریں گے۔

ولیم جیمس نے ایک کتاب مذھبی تجربے کی اقسام (Varietes of Religious Experience) کے عنوان سے لکھی، جس میں وہ مغربی ذہن کو مذہب کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس وقت یہ کتاب ناپید ہے، جس کا عنوان ہے (Varietes of Aesthetic Experience)
مصیبت یہ ہے کہ عام پڑھے لکھے فرد کا جمالیاتی ذوق صرف ظاہری چمک دمک تک محدود ہے، وہ اس سے آگے کچھ نہیں دیکھنا چاہتا۔ یہاں ہم قارئین کو ایک ایسا سادہ مگر جامع اصول بتاتے ہیں، جس کے ذریعے وہ کسی فنی شہ پارہ کو عقلی طور پر پرکھ سکتے ہیں اور اس کی صحیح قدر و قیمت کا تعین کر سکتے ہیں۔

میں ایک مثال کے ذریعے اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ جب چند افراد کے سامنے ایک سیب پیش کیا جائے گا تو کوئی اس کی ظاہری شکل و صورت سے متاثر ہوگا، کسی کو اس کی رنگت اچھی لگے گی، کسی کی توجہ اس کی خوشبو کی طرف جائے گی، کوئی اس کے ذائقے میں دلچسپی ظاہر کرے گا، لیکن کوئی ایسا بھی ہوگا، جو اس کی کلی اہمیت کا قائل ہوگا، یعنی اس کی نگاہ سیب کے تمام فوائد پر محیط ہوگی۔ بالکل اسی طرح جب ہم کسی انسانی چہرے کو دیکھتے ہیں تو اس کے ساتھ بھی یہی طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ کوئی صرف اس کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھتا ہے، کوئی اس کے رنگ و روپ کو، کوئی انسانی ذہن کی گہرائیوں اور وسعتوں میں غور و فکر کرتا ہے۔ کوئی ایسا بھی ہوتا ہے، جو اس کی ان تینوں خاصیتوں سے متاثر نہیں ہوتا، بلکہ اس کی روح تک رسائی حاصل کرتا ہے، جو انسانی شخصیت وجود کی ضامن ہے۔ ان مثالوں سے کسی فن پارے کی وحدت اور افادیت کو سمجھانا مقصود ہے۔

یہاں ہم لفظ "وحدت" (Unity) کی کچھ تشریح کریں گے۔ مثلاً کسی چیز

کے مشاہدہ سے مجھے خوشی ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے شعوری کوشش کے بغیر اس کی اہمیت تسلیم کرلی۔ اگر یہ جذبہ میرے وجدان میں اچھی طرح مستحکم و مضبوط ہوگا تو کسی نہ کسی صورت میں اس کا رد عمل ہوگا اور اس کا اظہار بھی ہوتا رہے گا، بشرطیکہ اس کے بارے میں محسوس کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ اسی طرح اگر میرے اندر موثر اظہار کی صلاحیت ہوگی تو میں دیگر افراد کو اسی قدر یا اس سے کم و بیش متاثر کرسکوں گا، جتنا میں خود اس سے متاثر ہوں گا۔ بشرطیکہ ایسے لوگوں کی ذہنی سطح بھی میری سطح سے ملتی جلتی ہو، لیکن اگر صورتحال اس کے برعکس ہو تو پھر ایک قسم کا جذبہ حاصل کرسکتے ہیں جو اس کی ذہنی سطح سے ہم آہنگ ہو۔ اب اگر اس موقعہ پر از خود میرے اندر فوری رد عمل ظاہر نہیں ہوتا، بلکہ میں شعوری طور پر بیدار ہوتا ہوں اور اس مختصر عرصے میں اس چیز کے بارے میں تجربے سے ثابت باتوں یا مواد کا تجزیہ کرنے لگوں تو اس صورت میں جو نتیجہ میں حاصل کروں گا، وہ یقیناً فنی تخلیق نہیں کہلائے گا، بلکہ وہ اس چیز کے بارے میں تجزیاتی تحقیق ہوگی۔ یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ تجربے اور مشاہدے کی وحدت باقی نہیں رہتی اور اس میں خلل واقع ہوجاتا ہے۔ ایسا عمل صرف کسی نظریے کو متخیل کرنے کے مواد سے ہی ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ تجزیاتی طریقہ بیچ میں کہاں سے آیا؟ آخر یہ کلی نقطہ نگاہ تہ و بالا کس طرح ہوا؟ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ آخر یہ تجربہ جمالیاتی تجربہ کیوں ثابت نہیں ہوا؟

یہاں ہمارا تعلق ایک اہم مسئلے سے ہے، جس کو میں روشنی سے تشبیہ دیکر واضح کروں گا۔ دراصل یہ سب روشنی کی کیفیت پر منحصر ہے، جس کی وجہ سے یہ فرق پیدا ہوتا ہے۔ جب تیز روشنی پڑے گی تو نہ صرف وہاں موجود ہر چیز بالکل نمایاں نظر آئے گی، بلکہ اردگرد کی دوسری چیزیں بھی اوجھل ہوجائیں

Marfat.com

گی۔ اسی طرح مدھم اور منتشر روشنی کی وجہ سے اشیاء کے سائے غیر واضح عکس کی طرح محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں ایک کی بجائے دوسری چیز نظر آئے گی اور ہماری کیفیت دیکھنے کی بجائے ٹومک ٹائیاں مارنے والے کی طرح ہوجائے گی۔ مثلاً میں کوئی سیب دیکھتا ہوں، میری نگاہ پہلے اس کے لال حصے پر پڑتی ہے، پھر اس کے پیلے حصے پر، پھر ٹہنی سے لٹکنے والی جگہ پر اور آخر میں لٹکنے کی حالت پر۔ اس طرح گویا میں نے اس کے ایک ایک ذرے کا معائنہ کیا۔ ظاہر ہے میرا یہ مشاہدہ تجزیاتی قسم کا ہے اور اس کے بارے میں میرا یہ علم نسبتی یعنی ناقص نوعیت کا ہے، کیونکہ اس طریقہ کار میں مجھے اس سیب کے مختلف حصوں کے بارے میں علم تو حاصل ہوا، لیکن اس کے پورے یا کلی حسن کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہوئی۔ ذرا سوچیئے! اگر اس قسم کی شعوری تفریق کے بغیر سیب اچانک اور مکمل طور پر میرے مشاہدے میں آتا، یعنی اپنی پوری اہمیت سمیت میرے ذہن پر چھا جاتا اور ایک احساس کے بعد دوسرے احساس کی صورت میں ظاہر ہونے کے بجائے یک لخت اور کلی طور پر سامنے آتا تو یہ احساس پہلے سے یقیناً جدا ہوتا اور یہی درحقیقت جمالیاتی نگاہ کا حامل ہوتا۔

یہاں یہ سوال آسانی پوچھا جاسکتا ہے کہ وہ "کُل" کیا ہے؟ "کُل" اور "جز" بظاہر ایک نسبت ہے جس طرح ہاتھ ایک عضو کی حیثیت میں "کُل" ہے، لیکن اسی طرح وہ ایک بڑے "کُل" یعنی جسم کا حصہ بھی ہے۔ اسی طرح انگلی کے بارے بھی کہا جاسکتا ہے۔ الغرض ہر چیز بیک وقت "کُل" بھی ہے تو "جز" بھی۔ یعنی ہمارا اشیاء کے خارجی وجود سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمارے لئے سوچنے کی خاص بات یہ ہے کہ ان اشیاء کے بارے میں ہمارا احساس کیا ہے؟ بالفاظ دیگر اس نظریے کی گہرائی اور گیرائی کتنی ہے؟ یہ چیز اس کلی چیز کی صلاحیت کو اجاگر کرتی ہے۔ اور جس قدر کلی چیز میں صلاحیت اعلیٰ درجے کی ہوگی، اسی نسبت

سے اس کے پرکھنے کی صلاحیت بھی وسیع درجے کی ہوگی۔

## وحدتِ فن (Unity in Art)

یہاں پہنچنے کے بعد میں قدیم فکر نے وحدت فن کے بارے میں باقی ایک مثال پیش کروں گا۔ ہم نے ارسطو کی ڈرامائی وحدت کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے، اس کا کہنا ہے کہ کسی بھی اچھے ڈرامے کے لئے زمان، مکان اور عمل کی وحدت لازمی، بلکہ بنیادی شرط ہے اور کسی بھی ڈرامے کو اس وقت تک فنی تخلیق کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، جب تک اس میں یہ بنیادی وصف موجود نہ ہو۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یونانی علماء صدیوں تک ان لکھنے والوں کا تمسخر اڑاتے تھے، جنھوں نے ڈرامہ لکھتے وقت ارسطو کی بیان کردہ وحدت کے نظریہ کے خلاف ورزی کی۔ یہ خیال اس حد تک راسخ ہوچکا تھا کہ اٹھارہ اور انیسویں صدی تک فرانسیسی، شکسپیئر پر محض اس وجہ سے ہنستے تھے کہ انہوں نے ایک عظیم دانشور کے ان بنیادی اصولوں کو بالکل نظرانداز کردیا ہے۔ ہمارے خیال میں اب تک یہ اختلاف جاری ہے۔ بعض لوگ اب تک اس بات پر اتنا یقین رکھتے ہیں جتنا اس معاملے میں ارسطو کو یقین حاصل تھا۔ ہاں، لیکن معمولی غور وفکر ہمیں اس بات کا قائل کرسکتا ہے کہ جنھوں نے ایسا کیا، ان پر الزام نہیں۔ یہ کہنا بھی عقلمندی نہیں کہ ان کی دلیل میں کوئی وزن نہیں، بلکہ اکثر لوگوں کو یہ بات وزنی معلوم ہوتی ہے اور اس میں کچھ سچائی بھی معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال اگر اس بات میں برائے نام بھی حقانیت و صداقت ہے تو پھر وہ یہ سمجھنے میں غلط نہیں ہیں کہ ارسطو کی اس بات میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ ان کی غلطی صرف یہ ہے کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ شیکسپیئر جیسا عظیم تخلیقی ذہن خواہ مخواہ غلطی پر نہ تھا۔

بہرحال ایسے بہت سے لوگ جو اس سلسلے میں ابھی تک کسی آخری اور

حتمی نتیجے پر نہیں پہنچے، وہ شیکسپیئر کے ڈرامے سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں، جس نے ان وحدتوں کی پابندی کو قبول نہیں کیا۔ بمقابلہ اینجلس کے، جس نے اپنے ڈراموں میں ان وحدتوں کی پوری پوری پابندی کی ہے۔ گویا یہاں ایک بڑا بحران ہے۔ بعض لوگ ایک کی طرفداری کرتے ہیں اور اس کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں اور بعض دوسرے کی تعریف کرتے ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں۔ جبکہ بعض لوگ دونوں کی تعریف کرتے ہیں، مگر انہیں معلوم نہیں کہ اس اختلاف کو کس طرح رفع کیا جائے یا دونوں کے مختلف نظریات میں کس طرح تطبیق دی جائے؟

اب آئیے ہم آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا ہم اس الجھن کا کوئی حل تلاش کر سکتے ہیں؟ ہمیں معلوم ہے کہ اس دنیا میں جو بھی چیز ہے، لازماً اس کی اپنی کوئی نہ کوئی صورت اور ہیئت ہے، قطع نظر اس امر سے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہو یا انسان کی، بہرحال ہر تخلیق کے لئے صورت یا ہیئت کا ہونا لازمی ہے۔

آرٹ یا فن کو تھوڑی دیر کے لئے ایک طرف رکھ کر آئیے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ انسان کی زبان کس طرح وجود میں آئی۔ مثلاً جب میں اپنی اس خواہش کا اظہار کرنا چاہوں کہ میں گھر جانا چاہتا ہوں تو لامحالہ طور پر مجھے اپنی خواہش کو الفاظ کا جامہ پہنانا پڑے گا اور مجھے اس طرح کہنا پڑے گا کہ "میں گھر جانا چاہتا ہوں"۔ میں اپنی اس خواہش کا اظہار اس طرح بھی کر سکتا ہوں کہ: چاہتا ہوں میں گھر جانا۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ لسانیات کے ماہرین نے انداز تکلم کے بہت سے نمونے سامنے رکھ کر پہلے جملے کو ہی زیادہ موزوں و مناسب سمجھا ہے۔ اس لئے انہوں نے یہ کلی قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ مبتدا یعنی جس کے بارے میں کوئی بات کی جائے، ہمیشہ شروع میں آتا ہے۔ اس کے بعد موضوع کی خبر آتی ہے۔ اس قاعدہ کو وضع کرنے کے بعد اگر کوئی جملہ اس ترتیب کے مطابق نہ ہو تو

Marfat.com

اسے گرامر کے لحاظ سے غلط کہا جاتا ہے اور یہ بات ہماری جہالت کو ظاہر کرتی ہے۔

یہیں سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ اصول یا قواعد کس طرح جنم لیتے ہیں۔ یعنی اصول یا قواعد ہیئت یا شکل و صورت سے پہلے ظاہر نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے صحیح انتخاب کے لئے ایک سے زیادہ صورتوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔

عمومی قواعد و ضوابط تو بہت آگے چل کر پھر ظاہر ہوتے ہیں۔ الغرض اس طرح کوئی بھی اصول، قاعدہ اور نظریہ وضع کرنے والا خواہ وہ ارسطو ہو یا کوئی اور فلسفی، ان کے اصول و قواعد کافی عرصہ بعد میں ظاہر ہوتے ہیں، ان سے پہلے ہیئت یا صورت کو تخلیق دینے والے اپنا کام پورا کرتے ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو پھر پورے عمل کا دارومدار اشیاء کی موجودہ صورتوں، ہیئتوں اور ان کے انتخاب پر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب بہتر صورتیں وجود میں آجاتی ہیں تو بعد میں قواعد و ضوابط بھی اس کے مطابق ترتیب دیے جاتے ہیں۔ چھوٹی اور تنگ ذہنیت رکھنے والے لوگ صدیوں تک صورتوں کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں اور ایسا کرنے میں خوشی اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ مگر جب اچانک کوئی بڑی ہستی نمودار ہوتی ہے، جو پرانی صورتوں کو ختم کر کے نئی صورتوں کو تشکیل دیتی ہے تو وہ لوگ اس کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات نہ صرف اس ارتقا پذیر کائنات کے ہر مرحلہ میں صحیح ثابت ہوئی ہے، بلکہ انسان کی اندرونی دنیا اور اس کی ہر سرگرمی کے بارے میں بھی پوری ثابت ہوتی ہے۔

درحقیقت قواعد، ضوابط، اصول و نظریات اور نظاموں کو وضع کرنے والے صورت وہیئت تخلیق کرنے والوں کے مقابلے میں کم حیثیت کے مالک ہیں۔ اس لئے ہمیں بھی یہاں ارسطو کو بہت بلند مقام سے نیچے لانا پڑے گا۔ یوں بھی ارسطو نے دوسرے درجے والا کام کیا ہے، جبکہ شیکسپیئر اپنے فن کی دنیا میں اس سے کہیں بلند مقام رکھتا ہے۔ ارسطو بہر حال دوسرے درجے کا کام کرنے کے

Marfat.com

باوجود بڑی حیثیت کا مالک بھی ہے اور اس نے جو کام کیا ہے، اس میں اس کا کوئی دوسرا ہمسر نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس کے قواعد و اصولوں کی نہایت خبرداری سے تحقیق و تدقیق کریں۔ کیونکہ لامحالہ طور ان میں کوئی نہ کوئی صداقت مضمر ہوگی۔

اسی طرح اس نے لازماً اپنے وقت کے ڈراموں کا تجزیہ کر کے ان میں سے کسی بہترین ڈرامے کا انتخاب کیا ہوگا اور اس خاص ڈرامے کی امتیازی خوبیوں کو بیان کرنے کے بعد دنیا کو بتایا ہوگا کہ اس کا یہ انتخاب مثالی حیثیت رکھتا ہے۔

مگر یہاں اس بات کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ارسطو نے بھی سب سے پہلے کسی خاص فنی شہ پارے کو پسند کیا ہوگا اور اس کے بعد بیٹھ کر اس بات کا شعوری تجزیہ کیا ہوگا کہ آخر یہ چیز اسے کیوں پسند آئی؟ مطلب یہ ہے کہ وہ کسی چیز کو پسند اور منتخب کرنے والا ہے اور یہیں سے ہماری پوری بات شروع ہوتی ہے، یہی نقطہ ہمارا بنیادی رہنما اصول ہے۔ ارسطو نے دیکھا ہوگا کہ اس کے پسندیدہ ڈرامے میں وحدت کے اوصاف موجود ہیں اور دوسرے ڈرامے جو اسے پسند نہیں آئے یا ناقص نظر آئے، ان کے اندر یہ وحدتیں موجود نہیں ہوں گی۔ اس وجہ سے اس نے وحدتوں کا یہ اصول وضع کر لیا، مگر اب ہمارے سامنے ایک نسبتاً اچھے نمونے موجود ہیں اور خاص بات یہ کہ یہ نمونے ہمیں ارسطو کے نمونوں سے زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی کوئی بہتر اصول ہے جس کا ارسطو تجزیہ کر کے اسے دریافت نہ کر سکا تھا۔

یہاں پہنچنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کوئی مخصوص قسم کی وحدت نہ تھی، جس کی طرف ارسطو نے اشارہ کیا تھا، بلکہ یہ بصیرت اور نقطہ نظر کی وحدت ہے، جو ہر فنی تخلیق کی اساس اور لازمی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ شیکسپیئر میں بھی ہمیں یہی بات ملتی ہے جب وہ ارسطو کی بیان کردہ وحدتوں کو کوئی

Marfat.com

اہمیت نہیں دیتا، یعنی وہ کسی چیز کی وحدت نہیں ہے، جس کے بارے میں ہمیں کوئی تجزیہ نگار بیٹھ کر بتائے، بلکہ یہ نگاہ کی وحدت ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ جمالیاتی آنکھ رکھنے والا انسان اپنی ایک نگاہ میں کتنا کچھ جذب کرسکتا ہے اس کے بارے میں شیکسپیئر کے ہاں جو بصیرت، وسعت اور جامعیت ہے وہ قدیم یونانی ڈرامہ نویسیوں سے بہت بلند ہے مطلب یہ ہے کہ قدمائی زمان و مکان کا غلبہ شیکسپیئر کے مقابلہ میں زیادہ چھایا ہوا ہے۔

ارسطو نے بھی خود اس بات کو محسوس کرلیا تھا کہ کسی تخلیق کے لئے فطری وحدت کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر نہ تو اس میں کوئی انفرادیت پیدا ہوسکتی ہے، اور نہ ہی زندگی۔ بہرحال زمان و مکان کی حد بندی اتنی اثر انداز نہیں ہوتی، جتنی بصیرت، اس لئے بصیرت کی وحدت کا زیادہ ہونا لازمی امر ہے۔ البتہ کسی دوسری قسم کی وحدت کے لئے ہمیں خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

شیکسپیئر مختلف زمانوں اور مختلف جگہوں کے واقعات کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر ایک کل بناتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کالیداس نے اپنے مشہور زمانہ ڈرامے شکنتلا میں زمین اور آسمان کو ملادیا ہے۔ مگر اس کے باوجود شکنتلا ڈرامہ نویسی میں عظیم شاہکار کا درجہ رکھتا ہے، جسے کوئی بھی پڑھنے والا اس کے حسن اور وحدت سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اپنی اس رائے کی تائید میں ہمیں یہ بہتر نظر آتا ہے کہ یہاں گوئٹے کے ان بے اختیار تعریفی جملوں کو نقل کریں جو اس سلسلے میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔

"اگر آپ کائنات اور دھرتی کو کوئی مشترکہ نام دینا چاہتے ہیں تو پھر اس کا نام "شکنتلا" ہے اور یہی اس کی مکمل تصویر ہے۔"

بہرحال آج ہم ارسطو کے مقابلے میں آسانی سے زیادہ عمومی نتائج حاصل

کر سکتے ہیں، بلکہ اس بھی زیادہ بنیادی اور واضح قسم کے اصول وضع کر سکتے ہیں، کیونکہ اب ہمارے پاس زیادہ مثالیں موجود ہیں، اسی طرح ہمارے لئے اس کے مقابلے میں بہتر تشریح کا امکان موجود ہے۔

الغرض ایک منفرد اور زندہ فنی تخلیق کے لئے فطری وحدت بنیادی حیثیت رکھتی ہے، نہ کہ زمان و مکان یا عمل کی وحدت، جیساکہ ارسطو کا خیال تھا۔ اس نقطہ کو زیادہ وضاحت سے سمجھانے کی خاطر ہمیں کچھ تشریح "حساسیت" کی بھی کرنی ہے۔ کیونکہ جب سے ملٹن نے شاعری کے لئے ان تین باتوں یعنی حساسیت، سادگی اور جذباتیت کو لازمی بتایا ہے، تب سے اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ بہر حال بہت کم لوگ یہ بات سمجھتے ہیں کہ "حساسیت" اور "اعلیٰ حساسیت" کے بیچ کی لکیر اتنی واضح نہیں جس قدر اسے سمجھا جاتا ہے۔ اس غلطی پر زیادہ بحث ہم حدود فن کے عنوان کے ذیل میں کریں گے۔

## حدود فن (Dimensions Of Art)

کسی بھی فنی تخلیق کی حدود سے مراد جیساکہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، اس کی وسعت (Breadth) گہرائی (Depth) اور اونچائی (Heght) ہے۔

عام طور پر کسی بھی فنکار کو پرکھنے کے لئے اس کی تخلیقات کی تعداد کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے اور جب تک اس کی یہ مقدار کافی زیادہ نہ ہو اس وقت تک اسے اصل فنکار نہیں کہا جاتا۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ صرف تعداد اور مقدار کی کثرت فنکار کی عظمت و اہمیت کے لئے کافی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک زیادہ لکھنے والا صحافی پچاس پیسے کی اجرت پر ایک عشقیہ افسانہ لکھ کر دیتا ہے، جس میں وہ تقریباً ایک ہی انسانی تجربے کو دہراتا ہے اور اس میں کوئی بھی معنوی جدت، مواد اور ہیئت کی تبدیلی نہیں لاتا تو اس صورت میں اسے فنکار کہنا محال اور مشکل ہے۔ اس لئے مقدار کی کثرت بذات خود کوئی معیار اور کسوٹی

نہیں۔ "وسعت" سے ہماری غرض یہ ہے کہ فنکار اپنی تخلیقات میں آفاقی زندگی کا کس قدر احاطہ کرسکا ہے اور اس موضوع کو بیان کرتے ہوئے کس قدر رنگارنگی پیدا کرسکا ہے اور کونسے کونسے نئے نئے پہلو روشن و نمایاں کر کے بیان کرسکا ہے۔ "گہرائی" سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اس کی نگاہ کتنی دور رس ہے۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ یہ پوری کائنات گویا ایک کتاب کی طرح ہے۔ اس کا پڑھنے والا صرف اس کے رواجی بیان کے حسن سے متاثر ہوتا ہے اور اسی میں مگن ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا قاری براہ راست اس میں موجود "تخیل" تک پہنچ جاتا ہے۔ ایک تیسرا آدمی ان دونوں کے برعکس کسی ایسی خوبی سے متاثر ہوتا ہے، جس کے بارے میں اسے اچھی طرح علم نہیں ہوتا، مگر وہ اس میں بالکل جذب ہوجاتا ہے۔ پس اس بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس کتاب کی حسین روح سے متاثر ہوتا ہے اور خود کو بلندی پر محسوس کرتا ہے۔ اس بلندی کو ہم "اونچائی" کہتے ہیں۔ بہر حال یہ موقعہ نہیں ہے کہ ہم شاہ عبداللطیف بھٹائی کے فن اور ان کے دوسرے پہلوؤں پر تفصیلی بحث کریں۔ اس بارے میں یہاں مختصر بیان پر اکتفا کی جائے گی۔ یوں بھی تفصیلی بحث کے لئے ہمیں ان کے رسالہ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

اب جہاں تک شاہ عبداللطیف بھٹائی کے وسعت فن کا تعلق ہے تو فطرت کی چھوٹی سے چھوٹی اور حقیر سے حقیر چیزیں بھی ان کے ہمدردانہ رویہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ وہ جس طرح حسین پیرایہ میں کبوتر کو محبوب کا قاصد بناتا ہے، اسی پیرایہ بیان میں چاند کو بھی استعمال کرتا ہے۔ غرض وہ ایسے لاثانی گیتوں کا خالق ہے کہ صدیوں تک ایسے گیت یہاں نہیں سنے گئے۔ حالانکہ ان کے دور کا مقامی ادب، بلکہ اس زمانے کا عالمی ادب بھی اس روایت سے خالی نظر آتا ہے۔ بہر حال یہ سب کچھ ان کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ممکن ہوا، کیونکہ ان کی

Marfat.com

پوری زندگی صحرا نوردی اور بیابانوں میں گذری، نیز وہ راتیں جاگ کر گذارنے کے عادی تھے، وہ اپنی شاعری میں ملاحوں، مچھیروں، کسانوں، شہزادوں سب کو آسانی اور آگاہی سے بیان کرتا ہے۔ وہ ان کی زبان اور محاوروں میں اس قدر پختہ انداز میں بات کرتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ خود بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی مرد عورت یا بچے کے بارے میں بات کرتے ہیں تو خود وہی روپ اختیار کرتے ہیں۔

جہاں تک ان کے فن کی گہرائی کا تعلق ہے تو ہم اوپر یہ بیان کر چکے ہیں کہ ان کی نگاہ نہایت تیزی سے فطرت کی گہرائی تک رسائی حاصل کر لیتی ہے اور وہ ظاہری شکل وصورت کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ ان کے فن کی گہرائی کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ اس کائنات کو ایک "مکمل کل" کی حیثیت دے کر اسے کثرت میں تقسیم نہیں کرتے۔

اسی طرح جہاں تک بلندی کا تعلق ہے تو ہمیں بمشکل کوئی آدمی ایسا ملے گا، جو خواہ عملاً کتنا ہی ذہنی وفکری آدمی ہو، یا اس کے برعکس وہ ناخواندہ کیوں نہ ہو، مگر جب وہ شاہ عبداللطیف کا کلام سنتا ہے تو چند ساعتوں کے لئے خود کو بھلا دیتا ہے اور بلندیوں پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ بہر حال ہمارا شاعر جن بلندیوں پر ہے، اس کے بارے میں ہم کچھ بعد میں عرض کریں گے، فی الحال ہم اس پیچیدہ بحث پر جس پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، یہیں چھوڑ کر "ٹیکنک" کی طرف آتے ہیں۔

## ٹیکنک (Technique)

عام طور پر سوال کیا جاتا ہے کہ کیا ذات اور دین ایک دوسرے کے ساتھ لازم ملزوم ہے؟ بالفاظ دیگر کیا "ٹیکنک" الہام کا اٹوٹ انگ حصہ ہے یا اس سے جدا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس سے دونوں باتیں وابستہ ہیں۔ فن کے بعض ماڈل

Marfat.com

دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مواد اور وقت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ مثلاً عمارت سازی کے فن کے اظہار کے لئے زیادہ مواد بھی چاہئے اور وقت بھی۔ اسی طرح جس شعور یا الہام سے ان کی ابتدا ہوتی ہے، اس میں بھی تبدیلی اور اصلاح کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ مواد کی نوعیت بھی صورتحال پر اثرانداز ہوتی ہے۔ جو نتیجہ سنگ مرمر سے حاصل ہوتا ہے، وہ اینٹوں اور گارے کی تعمیر سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہی بات سنگتراشی کے ساتھ بھی اسی طرح لاگو ہوتی ہے، اگرچہ نسبتاً کم۔ اس کے بعد مصوری ہے۔ یہاں نہ کوئی بڑا مواد مطلوب ہوتا ہے اور نہ ہی زیادہ مواد اکٹھا کرنا مشکل کام ہے۔ اسے مکمل کرنے میں وقت بھی کم لگتا ہے، اور نسبتاً جسمانی قوت بھی کم درکار ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اس فن کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ اس کا اظہار فوری طور پر نہیں ہوتا۔

اس کے بعد "شاعری" ہے۔ یہاں کسی قسم کے خارجی مواد کی ضرورت نہیں، سوائے اس کے کہ کسی زبان کے اقوال کو ترتیب دیا جائے۔ پھر "خوش قسمتی" کا کوئی آلہ بھی درکار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ الہام یعنی شعور کے بعد فوری اظہار ممکن ہے، البتہ کچھ شعراء کے لئے الفاظ خود بخود سامنے نہیں آتے۔ ازاں سواء الفاظ اور جملوں کی تلاش اور اس سے بڑھکر کسی خاص ہیئت کی تکمیل وغیرہ خیالات کے بیک وقت اظہار کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایسے لوگ موجود نہیں ہیں، جن کے پاس الفاظ خود بخود بغیر کسی شعوری کوشش اور کاوش کے موجود نہیں ہوتے اور ان کو کسی مخصوص ہیئت یا قاعدے قانون کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

سب سے آخر میں فن موسیقی ہے۔ اگر کوئی تخلیق واقعتاً قابل ذکر ہے تو پھر اس کے لئے صرف آواز بھی کافی ہے۔ اس صورت میں یہ آواز سوائے کسی شعوری کوشش کے فطری طور پر خود بخود آتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس

Marfat.com

صورت میں الہام آواز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ آوازیں نہ صرف خوبصورت اور سریلی ہوتی ہیں، بلکہ ان میں اتار و چڑھاؤ بھی ہوتا ہے۔ اس نقطے کی زیادہ وضاحت کے لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ قارئین کے لئے "موازرت" کی سوانح حیات سے درج ذیل اقتباس پیش کریں:

"ننھا منھا موازرت اس لحاظ سے پیدائشی طور پر خوش قسمت تھا کہ دنیا میں قدم رکھتے ہی اسے آواز پر مکمل قدرت حاصل تھی۔ علاوہ ازیں قدرت کی طرف سے اسے خوبصورت ترنم اور آواز میں اتار و چڑھاؤ کی مہارت تامہ بھی حاصل تھی۔ چنانچہ چار سال کی عمر ہی میں اس نے سارنگ بجانا شروع کیا تھا۔ پانچ برس کی عمر میں وائلن ہاتھ میں لیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ پہلی نظر میں ہی موسیقی کو سمجھ لیتا تھا۔ اس نے بچپن میں ہی سروں کی علامتوں اور آواز کی علامتوں کا فن سیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ان کی ترتیب کی طرف توجہ دی۔ بڑی بات یہ ہے کہ چھ سال کی عمر میں اس نے رباب بجایا۔ آج بھی دور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی اور کی نہیں موزارت کی تخلیقات ہیں۔"

"واقعی جیساکہ تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ وہ جدید یورپی موسیقی کا عظیم ترین بانی ہے۔"

مذکورہ اقتباس سے پڑھنے والوں پر واضح ہوگیا ہوگا کہ ہم فنکار کے لئے فوری رد عمل، شعور کی عدم مداخلت اور برملا اظہار جیسی خصوصیات پر کیوں اتنا زور دے رہے ہیں۔ درحقیقت کسی بھی فنکار کے لئے ہم آہنگی اور توازن لازمی عنصر ہے۔ ان کے اظہار کے لئے خارجی امداد پر جس قدر کم سے کم بھروسہ کیاجائے، اتنا بہتر ہے، بلکہ جس قدر ممکن ہو، یہ عمل فی الفور تکمیل پذیر ہونا چاہئے تاکہ الہام اور اس کی تکمیل میں وقفہ حائل نہ ہو۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہر فنی شہپارہ کے لئے کسی نہ کسی حد تک موسیقی کا تناسب ضروری ہے۔ ایک فنی

تخلیق میں موسیقی سے جس قدر مناسبت ہوگی، اسی قدر اس میں زیادہ سچائی ہوگی۔ مگر یہ مشابہت ہمہ گیر ہونی چاہئے۔ یہیں سے معلوم ہوا کہ فن کا حتمی تجزیہ اس حقیقت پر منحصر ہے کہ اس میں موسیقی کا تناسب کس قدر ہے۔ چنانچہ کارلائل نے کہا تھا کہ اگر کوئی شاعری گائی نہیں جاسکتی تو پھر اسے شاعری نہیں کہا جاسکتا۔ اسی بنا پر موازرت نے بھی یہ رائے دی تھی کہ عظیم موسیقی وہ نہیں ہے جس کی آواز اور سر میں جذباتیت اور ہیجان انگیزی کا رنگ غالب ہو یا تصویر کشی کی گئی ہو۔ بلکہ یہ جذبہ ایک ایسا فطری بہاؤ ہے، جس میں شعور کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ آواز کا اتار و چڑھاؤ جو دانستہ طور پر موسیقی میں شامل ہوجاتا ہے، وہ مصنوعی اور خودساختہ عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ فارسی کے عظیم شاعر حافظ نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ جسے فن کا استاد سمجھتے ہیں، اسے اگر گہری نگاہ سے دیکھیں گے تو وہ آپ کو ایسا مسخرہ نظر آئے گا جسے طبع سلیم سے کوئی حصہ نہیں ملا ہے۔

فن کے ان عظیم اساتذہ کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ سچے الہام کا انحصار فنکار کے رویہ پر ہے۔ جس قدر زیادہ وقت، وقفہ اور شعوری عمل اس میں حائل ہوگا، اسی قدر جمالیات کے صحیح اظہار میں کمی واقع ہوگی۔

## الہام یا جذبہ (Inspiration)

ٹیکنک کے بارے میں مذکورہ بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم اس بات کو ایک بار پھر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ایک ہی چیز مختلف لوگوں کے لئے ان کی ذہنی سطح کے مطابق مختلف نوعیت کے جذبات پیدا کرنے کا سبب اور ذریعہ بنتی ہے اور ان کے لئے اس کی اہمیت بھی جداگانہ ہے۔ اسی طرح ہمیں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرنا چاہئے کہ ہر فنی تخلیق کے لئے کسی نہ کسی ہیئت وشکل وصورت کا ہونا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں ان میں کسی پرواز تخیل اور حسن کے

Marfat.com

پہلو کا ہونا بھی لازمی ہے۔ یہ اصول ہر قسم کی فنی تخلیق کے ساتھ لاگو ہوتا ہے۔ مزید توضیح کی خاطر ہم بعض عظیم فنکاروں کی مثالیں اور ان کا طریقہ کار پیش کرتے ہیں۔

گوئٹے نے نئے فنکاروں کے کام کرنے کے لئے اپنا طریقہ وضاحت سے لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب بھی کوئی چیز اسے متاثر یا مسحور کرتی تھی تو وہ فوراً اس کا اظہار نہیں کرتا تھا، بلکہ اس موضوع اور عنوان پر فی الفور کام شروع کر دیتا تھا۔ جس میں اس کی ہر قسم کی شعوری کوشش اور خاص تیاری بھی شامل ہوتی تھی۔ اس بارے میں وہ یہ مشورہ بھی دیتا ہے کہ اس سلسلے میں خارجی ذرائع بھی اختیار کئے جاسکتے ہیں، تاکہ اس عمل کو ہر لحاظ سے مکمل کیا جائے۔ پس اس میں کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کہ اگر مغربی نقادوں کے ہاں شاعری کی "صنعتگری" جیسی اصطلاحات ملتی ہیں۔

گوئٹے دراصل ملٹن کی طرح کتابی کیڑا تھا، اس میں اور ملٹن میں یہ فرق ہے کہ ملٹن ایک سنار کی طرح پہلے کسی چیز کو بیٹھ کر گھڑتا ہے، اس کے بعد کوئی موتی لے کر اسے چمکاتا ہے اور تیار کرتا ہے۔ اس کے برعکس گوئٹے اس سنار کی طرح ہے جو پہلے سب آلات تیار کر کے بیٹھتا ہے، اس کے بعد وہ موتی کو مطلوبہ شکل میں لاتا ہے اور آخر میں اس کو چمکا کر تیار کرتا ہے۔

لیکن شیکسپیئر ان دونوں سے جداگانہ ہے۔ اس کا فن ایک پودے کی طرح پروان چڑھتا ہے اور اچانک اس پر پھول لگنا شروع ہوتے ہیں، مگر آخر تک یہ علم نہیں ہو پاتا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ اس میں یہ تبدیلی کیونکر اور کس طریقے سے آئی۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے آئیے پروفیسر بریڈلی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کیونکہ مغرب میں ان ہی کو یہ شعور و ادراک حاصل ہے اور وہ اس صنعت گری یا شاعرانہ حرفت" والے نظریے سے اوپر پرواز کرتا ہے، وہ کہتے ہیں:

Marfat.com

"شاعری اصل میں تصنع اور بناوٹ کا نام نہیں ہے اور نہ ہی وہ سوچے سمجھے کسی مسئلے کا واضح بیان ہے۔ بلکہ اصل شاعری کی بنیاد ایک ایسی تخیلقی قوت اور حرکت سے ہے جس کا تعلق مبہم تخیلاتی مواد سے ہو اور اسے اپنی ترقی اور اظہار کے لئے جستجو حاصل ہو۔ لیکن اگر شاعر کو ہمیشہ یہ بات معلوم ہو کہ اس کی شاعری کا ایک معین مطلب ہے تو پھر وہ شعر کس لئے لکھے؟"

"ایک لحاظ سے شعر تو پہلے ہی کہا گیا ہوتا ہے، مگر اس کی تکمیل خود شاعر پر یہ حقیقت منکشف کرتی ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ دراصل ہوتا یوں ہے کہ شاعر اگرچہ اپنے کام کی ابتدا کر چکا ہوتا ہے یا جس وقت وہ شعر گوئی میں مصروف ہوتا ہے، اس وقت بھی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے اصل مقصود اور مفہوم پر حاوی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس اس کا مفہوم اس پر حاوی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا شعر ہمیں تخلیق کی طرح محسوس ہوتا ہے، نہ کہ دستکاری یا کاریگری کا کوئی نمونہ۔ ایسے شعر میں جادو کی سی تاثیر ہوتی ہے، جو تصنع اور تکلف کے ذریعے نہیں کہا جاسکتا۔ چنانچہ جب ہم ایسے شعر کے معانی اور مفہوم پر اصرار کرنے لگتے ہیں تو ہمیں جواب ملتا ہے کہ یہ شعر اپنے معانی کے لئے ازخود دلیل ہے۔"

براؤننگ سے جب پوچھا گیا کہ شعر گوئی سے اس کا مطلب کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ یہ تو پڑھنے والے پر موقوف ہے کہ وہ کسی شعر کا مطلب اور معنی کیا لیتا ہے؟ ادب اور فن کے عمومی حیثیت کے بارے میں بحث کے بعد ہم شاہ عبدُاللطیف کی شاعری اور ان کے طریقہ کار کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے شاعر کو اس بات کا ذرے برابر بھی خیال نہ تھا کہ وہ شعر کہے یا وہ شاعر کہلائیں۔ بنا بریں یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہ صاحب نے اپنی شاعری کی ایک سطر بھی ازخود نہیں لکھی۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ

Marfat.com

کاغذ و قلم لے کر شاہ صاحب شعر گوئی لئے بیٹھ گئے ہوں۔ بلکہ یہ کام تو وہ لوگ انجام دیتے تھے، جو ایسے اوقات میں ان کے مصاحب ہوتے تھے، یعنی جب ان پر وجد اور جذب کی کیفیت طاری ہوتی تھی اور ان کو اپنے حال کی بمشکل خبر ہوتی تھی، اس وقت وہ لوگ ان کے اشعار کو لکھتے تھے۔

مثال کے طور پر یہاں ایک ایسے ہی واقعے کا یہاں بیان کرتے ہیں۔ شاہ صاحب کی شعر گوئی کی ابتدا اس طرح ہوتی تھی کہ مجلس میں موجود کوئی راگ گانے والا وقت کے کسی مشہور و معروف شاعر کے بول گانے لگتا۔ ہندستانی موسیقی سے واقفیت رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ راگ گانے کا شب و روز میں ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ یہاں بھی اس اصول کی پابندی کی جاتی تھی۔ اس راگ سے شاعر پر وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ اسی کیفیت کے دوران وہ شعر کہتے تھے اور گاتے بھی جاتے تھے۔ گویا شاہ صاحب کے ہاں سوچ سمجھ کر شعر لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر اس واردات کو عمل کا نام دیا جائے تو پھر اس دوران ایک لحظہ بھی ضایع نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی وقفہ حائل ہوتا رہا۔ غرض یہ کہ موسیقی شاہ عبداللطیف بھٹائی کے لئے ایک ایسا ذریعہ ثابت ہوئی جس کی وساطت سے ان کے اشعار لوگوں تک پہنچے۔ آپ کے یہ بول عجیب قسم کی آفاقی موسیقی سے لبریز ہیں، جن میں اسرار و رموز اور معانی کے ایسے دریا پائے جاتے ہیں کہ آج تک اس کی گرہ کشائی ہو رہی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ شاہ صاحب کے شاعری کے جو بول ہیں، ان میں جو نغماتی کیفیت ہے، وہ گائکی میں موسیقی کو بھی مات کردیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں موسیقی شاعری کی ترویج کا سبب بنی۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ مشرق خواہ مغرب میں سرگم یا تال ہی موسیقی کا ذریعہ اور بنیاد ہیں۔ اس کی یہ وہ مسلمہ حیثیت ہے جس کی وجہ سے کسی گیت

Marfat.com

کے بول ادھر سے ادھر نہیں جاتے اور کسی بھی صورت میں موسیقی کی حیثیت ثانوی نہیں ہوسکتی۔ اس سلسلے میں مغرب میں جو سب سے پیاری دھن مشہور و معروف ہے وہ موزارت کی جادوئی دھن (The magic flute) ہے، لیکن اس کے جو اصلی بول ہیں، ان کے بارے میں نہ صرف یہ رائے پائی جاتی ہے کہ وہ ادنیٰ درجے کے ہیں بلکہ دراصل وہ بے معنیٰ الفاظ کے جال کی طرح ہیں۔

بہر حال شاعری کے لئے موسیقی کی حیثیت شاہی چوکیدار کی ہے اور اسے ایک اہم اصول کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے، لیکن شاہ عبداللطیف کے سلسلے میں یہ بات بالکل نرالی ہے۔ ان کی شاعری اپنے فطری اور آفاقی نغماتی کیفیات کی بدولت عام موسیقی پر حاوی ہے۔ بالفاظ دیگر موسیقی شاہ عبداللطیف کی شاعری کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ شاہ صاحب کی شاعری یہاں تک پہنچنے کے بعد کلاسیکی موسیقی کو محض ثانوی ذریعے کی حیثیت دیتی ہے۔ بنا بریں شاہ صاحب کی شاعری کا دوسری زبانوں میں ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل ان کی شاعری کے اسلوب، انداز بیان، معنیٰ اور روح میں ایسا توازن قائم ہے اور اس سے موسیقی کا ایسا سماں پیدا ہوا ہے جسے دوبارہ حاصل کرنا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مترجم زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہے کہ پڑھنے والوں کے سامنے شاہ عبداللطیف کے احساسات کو اپنے الفاظ میں پیش کرے۔ یا پھر مترجم خود اتنے اعلیٰ درجے کا فنکار ہو کہ شاہ عبداللطیف کی شاعری سے الہام حاصل کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہو اور پھر اس کے بعد اپنے جمالیاتی حس کے ذریعے اس کی تخلیق کرے۔

## لطیف کی تخلیقات کی ہیئت اور وحدت

یہاں چند الفاظ شاہ عبداللطیف کی شاعری کے ہیئت کے بارے میں بھی

Marfat.com

پیش کیے جاتے ہیں۔

سب سے پہلی بات جو نہایت یقین سے کہی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کسی بھی مقرر بحر، وزن یا ترکیب کی پابندی نہیں کرتے۔ مصرعہ کی لمبائی، قافیہ کا اہتمام اسی طرح پورے نظم میں اشعار کی تعداد یہ سب باتیں ان کے مزاج اور افتاد طبع پر منحصر ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے خود یا کسی اور نے ایسا کرنے کی تکلیف کی ہے۔ کیونکہ یہ بات انسانی ذہن میں نہیں آتی کہ شعر کہتے وقت شاعر کسی خاص اصول کی پابندی کرتا ہے۔ لیکن یہ بات حیرت انگیز ہے کہ شاہ صاحب کے راگ کے طور طریقے سننے والے کے دل و دماغ کو اچانک اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اس دوران اچانک موضوع کی تبدیلی وارد ہوتی ہے اور پھر جب تک مزاج پر چھائی ہوئی یہ تبدیلی طاری ہوتی ہے، شعر میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی موسیقی کی یہ خاص خصوصیت ہے کہ اس میں تکرار (Counter point) کا اہتمام بھی اکثر نظر آتا ہے۔ راگ کی دھنیں بھی ساتھ ساتھ چلتی ہیں جو ایک طرف اس میں مزید پراسرار کیفیت اور سکون پیدا کرتی ہیں تو دوسری طرف اس کی عمیق گہرائی میں بھی اضافہ کرتی ہیں۔ چنانچہ سننے والا شعر میں غور وفکر کرنے کی بجائے شعر کے جمالیاتی سحر اور آفاقی اثر میں محو و مستغرق ہوجاتا ہے۔ پس عام رواجی طریقے کے مطابق شاہ صاحب کے کسی شعر کی تشریح کا مطلب اس کی اہمیت اور وقعت کو کم کرنا اور اس کے معنیٰ و مفہوم سے رشتہ توڑنے کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ شاہ صاحب کی شاعری اس طرح کی تشریح سے بہت اونچی ہے، جہاں ذہن کی رسائی نہیں ہوسکتی ہو۔ دراصل یہ بلندی جہاں ان کی شاعری ہمیں پہنچاتی ہے، وہ ایسے جذبے اور امنگ کے ذریعے ممکن ہے، جو ناقابل تجزیہ ہے۔

اعلیٰ کلاسیکی موسیقی میں دھنوں کی تبدیلی اور تکرار کا اہتمام خصوصاً

Marfat.com

قابل ذکر ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس خصوصیت کا نہایت مؤثر استعمال کیا ہے۔ لیکن وہ خوانخواہ وہ زبانی تکرار اور قافیہ کی بندش کے ساتھ چمٹے ہوئے بھی نظر نہیں آتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے موسیقی کے بارے میں اتنی زیادہ گفتگو کی ہے کہ پڑھنے والا کہیں یہ بھول نہ جائے کہ موسیقی پر بھی وہی اصول لاگو ہوتے ہیں، جو کسی دوسرے فن پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں بالخصوص فنکار کے نقطہ نگاہ اور اس کی ذہنی سطح کے علاوہ فن کی وسعت اور گہرائی کو بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے، لیکن ساری موسیقی ایک طرح کی بھی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر کوئی بچوں کا گیت گاتا ہے یا کسی دھن کے ساتھ دل بہلانا مقصود ہوتا ہے۔ تو بہرحال یہ بھی ایک قسم کی موسیقی ہے۔

ابتدائی موضوع کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ موزارٹ عام سُروں کو "ایک تکونی فن" کہتا ہے، یا اسے آواز کی مصوری (Mlerie) کہتا ہے۔ لیکن وہ اسے روح کی اس بے اختیار چیخ کے مقابلے میں عظیم فن کا درجہ نہیں دیتا، جس میں شعوری عمل کو کوئی دخل نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ایسے عظیم فنکاروں کو نظرانداز کردیں جن کے ہاں جذبات کی ترجمانی اور مختلف مناظر کی مصوری قابل فخر بات سمجھی جاتی ہے۔

خواہ یہ باتیں ہمیں بیتھوون (Beethoven) اور ویگنر (Wagner) جیسے عظیم موسیقاروں کے ہاں ملیں، جن کی تخلیقات واقعی شاہکار ہیں، لیکن موزارٹ کے مکتبہ فکر کے مطابق موسیقی کا تعلق نفس سے نہیں، روح سے ہے۔ اس لئے وستار (Delineation) کرنا بے معنی بلکہ لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہونا ہے۔ اس کے بغیر اس میں روح کی وہ لہر شامل نہیں ہوتی، جو ذہن کی بندش اور ترغیبات سے آزاد ہو۔ غرض یہ کہ جب تک موسیقی اس حد تک نہ پہنچے

کہ اس میں قلبی سرور کی یہ کیفیت پیدا ہو، اس وقت تک وہ روح کو مطمئن نہیں کرتی۔ نیز ہر راگ اپنی نوعیت کا ہوتا ہے۔ بعض راگ ایسے ہوتے ہیں جو انسان کے اندر روزمرہ زندگی کے جذبات کو ابھارتے ہیں۔ بعض راگ الٰہی رموز واسرار کی طرف مائل کرتے ہیں، بلکہ عالم بالا کی سیر کراتے ہیں، جہاں سانس لینے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ حاصل کلام یہ کہ یہ بلکل ممکن ہے کہ راگ خواہ ہمیں گھر کے کسی گوشہ میں محدود رکھے یا فرش زمین سے اٹھا کر عرش الٰہی کی سیر کرائے۔

اب ہم حواس اور محسوسات سے اوپر کے معاملے کی طرف آتے ہیں۔ برٹس ٹامس نے ایک بار کہا تھا کہ "اگرچہ میری آنکھوں کو نظر نہیں آیا، مگر میں نے دیکھا۔ اس قول سے مابعد حسیاتی معاملے پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس بارے میں شاہ عبداللطیف کا راستہ ہی جداگانہ ہے، آنکھوں کو بہلا پھسلا کر وہ کہتے ہیں:

نہ پر پرین پسن کنان جی کر سامہون

یعنی اگرچہ میں نے کدھے کی طرف نگاہ کی مگر اس کے باوجود مجھے اپنا محبوب (یعنی ہر چیز کے خالق کے سوا کچھ) نظر نہ آیا۔

کیا آپ اسے اعلیٰ حسیاتی عمل نہیں کہیں گے؟ شاہ عبداللطیف یہاں خود کو نہیں بلکہ آنکھوں کو یہ اعزاز بخشتے ہیں، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یعنی معمولی اشیاء کو دیکھتے ہی مختلف معنوی اہمیت کا ادراک حاصل کرنا۔ اس بات سے بھی فنکار کے نقطہ نگاہ اور ذہنی سطح کے علاوہ اس کی روحانی کیفیت کی گہرائی کا پتہ لگتا ہے، جس سے وہ دیکھتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی اس سے بھی آگے جاتے ہیں اور کہتے ہیں: جب تک مجھ پر "میں" غالب ہوتی ہے، اس وقت تک میں کچھ دیکھ نہیں پاتا۔ اس لئے پہلے اس "میں" کو محو ہونا

Marfat.com

چاہئیے تو پھر غیر معمولی مشاہدات ہو سکتے ہیں۔ حاصل یہ کہ "انا" یا "میں" کا شعور ہر دوسرے شعور کو محو و مسخ کر دیتا ہے۔

یہاں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ایک کتاب بنام "گوری لڑکی خدا کی تلاش میں" سے ایک قتباس پیش کریں۔ جب یہ لڑکی گوئٹے سے شاہ عبداللطیف بھٹائی کا تعارف کراتی ہے اور ان کے "رسالہ" کے چند اشعار پڑھ کر ان کو بتاتی ہے، ان اشعار سے لطیف کے فن کی حیثیت، فنی وحدت اور ان کے نقطہ نظر وغیرہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

گوئٹے نے حاضرین مجلس سے اس غیر معروف شاعر کے بارے میں آگاہی چاہی۔ گوری لڑکی نے جس کے ساتھ اس کی پہلے سے آشنائی تھی، آگے آئی اور گوئٹے کو بتایا کہ ان کا نام "لطیف" ہے۔ یہ بھی بتایا کہ جتنی شہرت ان کو حاصل ہونی چاہئیے تھی وہ حاصل نہیں ہوئی، یہ کہہ کر ان کا یہ شعر پڑھا:

نہ کي کٹن پاڻ سين، نکو ساٹن پاڻُ،
اھڙو جن اھجاڻُ، آءُ نہ جيئندي ان ري.

یہ سن کر گوئٹے نے کہا یہ تو بہت دلچسپ خیالات ہیں۔ کیا تمہیں کچھ اور بھی یاد ہے؟ اس پر گوری لڑکی نے مزید درج ذیل شعر سنایا:

جت آھ نہ ناھ کا، اي خاکي جو خيال
جانب جو جمال، پسٹان ئي پري ٹئو.

اس کے بعد وہ لڑکی کہنے لگی کہ مجھے ان کے ڈرامائی سرساموںڈی سے یہ اشعار اس قدر یاد ہیں جن کو کبھی بھول نہیں سکتی۔

تن تنيندو آءُ، مک ڏھاڙي مکڙي،
سانباھي سمونڊ جي، منان مور م لاھ
اج کہ سنجھ صباح، اھرندين اتانگھ تڙين.

اس موقعہ پر لڑکی گوئٹے کی طرف منہ کر کے کہنے لگی کہ مجھے یہ شعر آپ کے

"فائوسٹ" کی یہ سطور یاد دلاتا ہے جو آپ نے اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرنے کے بعد کہے ہیں۔

"صرف وہی انسان آزادی و زندگی حاصل کرسکتا ہے جو ہر روزانہ لڑائی لڑکر آزادی نو حاصل کرتا ہو۔ یہ سن کر گوئٹے نے نہایت خوشی کے انداز میں واہ واہ کی اور کہا کہ میری خواہش ہے کہ کاش میں ان کے زیادہ قریب ہوتا۔"

مذکورہ اقتباس سے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے نقطہ نگاہ پر نظر پڑتی ہے۔ وہ زندگی کی صرف جسمانی ضروریات اور ان پر ضابطے کی بات نہیں کرتا، بلکہ وہ ان سے بہت اوپر پرواز کرتا ہے۔

اسلامی اثرات سے جس طرح یورپ کو نشاۃ ثانیہ کے لئے تحریک ملی، اسی طرح ہندستان کی نشاۃ ثانیہ میں بھی اس کا اتنا ہی عمل دخل ہے۔ بلکہ دونوں جگھوں پر اس کا کردار تقریباً یکساں ہے۔

جس طرح یورپ میں اصلاحی تحریک کے علمبرداروں نے مذہب کی اصلاح میں اپنا کردار ادا کیا، بالکل اسی طرح ہندستان میں ہوا۔ اس سلسلے میں تاریخی اوراق رامانج، کبیر اور نانک کی بجا طور پر نشاندہی کرتے ہیں۔ ہمیشہ مذہبی اصلاح کے بعد ہی آرٹ اور فن کا نمبر آتا ہے۔ ہندستان میں شاعری کے میدان میں اس کا آغاز تلسی داس نے کیا، حالانکہ وہ اپنی شاعری میں رامائنوں کے قدیم قصے کو ہی بنیاد بناتا ہے۔ یورپ میں یہ تحریک سب سے پہلے جرمنی میں پہنچی، جہاں شاعری کے بجائے موسیقی کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ وہاں اس تحریک کا باوا آدم باخ (Bach) ہے۔ ہندستان میں سندھ کے علائقے میں یہ تحریک سب سے آخر میں پہنچی۔

یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ باخ اور لطیف دونوں ہمعصر ہیں۔ باخ

Marfat.com

1685 اور لطیف اس سے چار سال بعد 1689 میں پیدا ہوئے۔ باخ نے 1750 میں انتقال کیا اور شاہ عبداللطیف نے دو سال بعد 1752 میں وفات کی۔ اسی طرح موزارٹ شاہ عبداللطیف کی وفات کے چار سال بعد پیدا ہوا۔ موزارٹ کے بچپن کے کچھ واقعات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ شاہ عبداللطیف کا بچپن بھی اسی طرح دلکش اور سرور انگیز ہے۔

بہرحال یہاں یہ موقعہ نہیں ہے کہ ہم یہ واقعات بیان کریں۔ یوں بھی یہاں ہمارا مقصد شاہ عبداللطیف کی تخلیقات کی وحدت کے بارے میں گفتگو کرنا ہے۔ لطیف کی تخلیقات کا بڑا میدان حسن و جمال ہے۔ یہ روح ان کی شخصیت پر پوری طرح حاوی ہے اور ان کی شخصیت کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ حد یہ ہے کہ جوانی کے عرصے کی دوئی پر بھی یہ چیز ان پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان کی ہر تخلیق زندگی کے اس مخصوص پہلو کی نمائندگی کرتی ہے۔ لیکن آخر میں یہ سب تعلقات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط، منظم اور مضبوط نظر آتے ہیں کہ ان کی زندگی ایک فطری "کل" کی مانند نظر آتی ہے۔ بہرحال یہ فطری ربط ان کی زندگی، ان کے نقطہ نظر، ان کے فن اور مرتبے پر مکمل طور پر حاوی نظر آتا ہے۔ نتیجتاً جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں، یہ روح ان کی زندگی میں غالب جز کی حیثیت میں نمایاں ہے، جیسا کہ موزارٹ کی بچپن کی تخلیقات اس کے ساتھ مخصوص ہیں، اسی طرح لطیف کی تخلیقات بھی ان کی زندگی کے ہر مرحلے کی نمائندہ ہیں، بلکہ کوئی شخص شاہ عبداللطیف کے اشعار کے پہلے اور آخری مصرعے کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے شعر کی بنیادی خاصیت یا ماہیت ہرگز تبدیل نہیں ہوتی۔ البتہ جس طرح ہر فنکار کے ساتھ ہوتا رہتا ہے، شاہ صاحب کے ہاں بھی شعر کی صورت ارتقا پذیر رہتی ہے اور وہ مستقل ایک نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کا رسالہ ایک کتاب کی

Marfat.com

صورت میں مکمل فطری وحدت کا حامل نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے گویا شاید پانچ برس کی چھوٹی سی عمر میں ہی یہ ارادہ کر چکے تھے کہ ان کی اس کتاب کی ترتیب کیسی ہوگی، اس کے تیس سر کس طرح مرتب ہوں گے اور ان کا اختتام کس طرح ہوگا۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ ہم ہر چھوٹی بڑی تخلیقی وحدت کے بارے میں بات نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اس سے ہماری مراد وہ وحدت ہے جو عارضی طور پر ایک فنکار کی تخلیق میں ہونی چاہیئے۔ لیکن ہمارے شاعر ممدوح کی شاعری میں یہ گویا جادو کے ذریعے پیدا کردہ مکمل فطری وحدت ہے جو ان کی پچاس برس کی فطری زندگی پر محیط نظر آتی ہے۔ یہ نہ صرف شاعر کی اپنی طبعی زندگی کے مختلف مراحل کی نمائندگی کرتی ہے، بلکہ اس میں بنی نوع انسان کی زندگی کے لئے اعلیٰ اسباق موجود ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں مضمر موروثی سرمایہ کی موجودگی سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔

اس لئے شاہ کا رسالہ اس وقت ایک پیغام بھی ہے تو سبق بھی۔ اس وجہ سے اس پر کارلائل کے اس نظریے کا اطلاق کیا جاسکتا ہے جو کہتے ہیں کہ:

"دوسری بات یہ ہے کہ جب علامت بذاتہ خود کوئی اندرونی ہو اور وہ اتنی طاقتور ہو کہ لوگ خود اس کے اردگرد جمع ہوجائیں، بلکہ ہونا یہ چاہئیے کہ اسرار الاہی نگاہوں کے سامنے گھوم جائیں اور ابدیت کی تھوڑی بہت جھلک وقت کی اس شکل و صورت میں محسوس ہونے لگے۔ فن کے سچے اور حقیقت پسندانہ شاہکار واقعی اس قسم کے ہونے چاہئیں۔"

"اسی طرح جب آپ اصل فن، فنی شہپارہ اور ایک مبتدی کی تخلیق میں فرق کرسکتے ہیں تو پھر آپ کو حقیقی

Marfat.com

تخلیق میں وقت کے سائے کے پس منظر میں ادبیت
جھلکتی نظر آئے گی اور اسرار الٰہی سے پردہ اٹھتا ہوا نظر آئے
گا۔ بنابریں علامات سب سے اعلیٰ و ارفع ہیں۔ جن کو
استعمال کرنے سے کوئی فنکار یا شاعر پیامبر کے درجے پر
فائز ہوسکتا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ کارلائل نے اپنے طور پر اس حقیقت کا یقین کرلیا ہے کہ فن کا بڑے سے بڑا شہکار "پیغام" (رسالہ) ہی ہے۔ لیکن پیغامبر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لازماً کوئی نئی خبر لے آئے گا، بلکہ وہ اپنے منفرد انداز کے ذریعے ایک ایسے پیغام کی نشاندگی کرتا ہے جو انسانی مستقبل کو ذات الٰہی سے جوڑتا ہے۔ اسی وجہ سے شاہ عبداللطیف کہتے ہیں:

جي تو بيت ڀانئيا، سي آيتون آهين،
نيو من لائين پريان سندي پار ڏي!

اسی بنا پر ہم نے کہا تھا کہ شاہ عبداللطیف فطری شاعر ہیں، یعنی آپ شاعر بنے نہیں، بلکہ شاعر پیدا کئے گئے ہیں۔ نیز انہیں بہت سی صفات ذات الٰہی سے وہبی طور پر عطا ہوئی ہیں۔ ہاں ہاں!! ہم نے کہا تھا کہ شاہ عبداللطیف موروثی طور پر کامل و مکمل سرمایہ لے کر آئے تھے، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ کسی بڑے گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی بجائے یوں کہا جاسکتا ہے کہ قدرت نے شروع سے ہی ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس طرح باقی زندگی بھی انہوں نے روح اور قلب کی گہرائیوں سے اس عظیم ہاتھ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھا۔ پھر جب انہوں نے اس دنیا سے دارالبقا کی طرف رخت سفر باندھا تو بھی آپ اس ذات کبریائی سے مزید قریب تر تھے۔

Marfat.com

## شاہ صاحب کے رسالہ سے چند ابیات

اب ہم ان قارئین حضرات کے استفادے کی خاطر جو شاعر ممدوح کی زبان سے واقفیت نہیں رکھتے، شاہ صاحب کے "رسالہ" سے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔ یہ ابیات بغیر کسی ترتیب کے سروں کی مناسبت سے یہاں دیئے جارہے ہیں۔ ہمیں قارئین کی استعداد پر پورا بھروسہ ہے کہ نمونتہً دیئے گئے ان اشعار سے جنس گراں مایہ کا اندازہ کرسکیں گے۔ اس سے پہلے ہم اس حقیقت پر کافی روشنی ڈال چکے ہیں کہ جوں جوں آپ آگے بڑھیں گے، صورت یا قالب پر زور کم ہوتا جائے گا، بلکہ عام معانی پر بھی اتنا زور باقی نہیں رہتا، جتنا اس کی روح پر، جسے دوسرے الفاظ میں معنوی اہمیت (Significance) کہا جاسکتا ہے۔

یہاں ہمیں یہ باور کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ایک عقلمند انسان کے لیے ایک چھوٹی سی انگلی کا طبعی وجود بھی بڑے معانی ومطالب رکھتا ہے۔ پہلے تو اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کس قسم کی انگلی ہے، پھر اس انگلی سے اس فرد کی نشاندہی کی جاسکتی ہے، جس کے ہاتھ سے وہ مربوط ہے، بلکہ اسی ایک انگلی سے اس شخص کے کردار کا پتہ لگتا ہے۔ یہ بھی آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آیا وہ انگلی ایک فنکار کی ہے یا کسی کسان کی؟ مطلب یہ ہے کہ اس طرح بہت ساری باتیں معلوم کی جاسکتی ہیں جو عام آدمی کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔ ہم پہلے یہ بات کہہ کر آئے ہیں کہ شاہ صاحب کی شاعری میں بڑے مطالب اور معانی مضمر ہیں اور ان تمام باتوں میں سادگی کے ساتھ ایسا حسین امتزاج موجود ہے، جسے عقلمند اور دانشور انسان ہی سمجھ سکتے ہیں۔

بہرحال یہاں ہم یہ ضرور تسلیم کریں گے کہ ایک عام آدمی کے لیے "صورت" یا "ہیئت" ہی زیادہ قابل توجہ ہوتی ہے۔ اس کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ وہ کوئی بھی کہانی از اول تا آخر سنے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا رومی نے قصوں

Marfat.com

اور کہانیوں کی صورت میں اپنا مطلب اور مدعا واضح کیا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا خیال بھی قصے کہانی کی صورت میں پیش کیا ہے اور مکمل کہانی کو ضروری ولازمی سمجھا گیا ہے، لیکن ہمارے شاعر کے ہاں صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی رح دریاء کو کوزے میں بند کرنے کے قائل ہیں، بلکہ کسی فارسی گوشاعر کے قول کے مطابق "عاقل راالشارہ کافی است" پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ واقعی جاہل آدمی کے لیے کتابوں کا ذخیرہ بھی بے معنیٰ ہے۔ اب ہم اس امید پر کچھ اشعار پیش کر رہے ہیں، جن کا انگریزی ترجمہ ایلسا قاضی نے کیا ہے۔ انہوں نے کوشش کی ہے کہ شاعر کے اصل ترنم یا لے کو برقرار رکھا جائے۔

(۱)

لڇان ٿي لاحد ۾ هادي لهان نہ حد،
سپريان جي سونهن جو، نہ کو قد نہ مد،
هت سڪڻ بي عدد ، هت پرين پرواهہ ناهہ ڪا.
سر آسا

میں "لاحد" میں تڑپ رہی ہوں اور میرے مولا مجھے حد نہ ملے، محبوب کے حسن کی نہ کوئی قد ہے نہ حد (یعنی محبوب کے حسن کی نہ کوئی حد ہے، نہ انتہا)
یہاں میں حد سے زیادہ مشتاق ہوں اور وہاں محبوب بے پرواہ ہے۔

(۲)

"آءُ" سين اُن پار، ڪڏهن تان ڪونہ ويو،
"ان الله وتر يحب الوتر" نيئي ہيائي ہار،
هيڪڙائي وٺ هار، هنجون جي "هئڻ" جون.
سر آسا

انا کو ساتھ لیکر منزل مقصود کو کوئی نہیں پہنچا
اللہ واحد ہے اور وحدت ہی کو پسند کرتا ہے، دوئی کو جا کر جلادے
توحید کے سایے میں بیٹھ کر اپنی ہستی کے آنسو بہادے

Marfat.com

(۳)

مون کي اکڙين، وڏا ٿورا لائيا،
تہ پڻ پرين پسن، ڪٺان جي ڪر سامهون.
سر آسا

میری آنکھوں نے مجھ پر بڑے احسانات کئے ہیں
کہ وہ بہر حال فقط محبوب کو ہی دیکھتی ہیں باوجود اس کے کہ
رقیب کی طرف بھی نظر اٹھاتا ہوں

(۴)

"آءُ" اوريان جهل تون، ڇڏيم پاڻ پچار،
شرڪ ساڻ ستار، گهڻا گهاريم ڏينهڙا،
سر آسا

اے اللہ! میری انا کو ادھر ہی روک دے کہ میں نے اپنے ذکر کو چھوڑ دیا
اے ستار! میں شرک کے ساتھ بہت دن گذار چکا ہوں

(۵)

سنئين سُنهائي سڀ ڪا، ڪامون منجهائي
طلب ۽ تحصيل، اوريائي آئي،
مان تند تت لائي، جت آه نہ ناهہ ڪا.
سر آسا

سب مجھے سیدھے راستے پر لا رہے ہیں، کوئی تو ایسا بھی ہو جو مجھے حیران و پریشان کر دے

طلب اور تحصیل کے ساز تو ابتدائی ہیں، میں نے اپنا رشتہ وہاں جوڑا ہے، جہاں نفی اور اثبات موجود ہیں۔

(٦)

جت آهه نه ناهه ڪا، اي خيال خاڪي،
پرين جي پاڪي، پسڻان ئي پري ٿي،
سر آسا

یہاں نفی اور اثبات نہیں ہے، یہ خیال بھی خاکی انسان کا ہے
باقی محبوب کی پاکی نظر و ادراک سے بلند تر ہے

(٧)

تن تسبيح، من مڻيون، دل دنبورو جن،
تندون جي طلب جون، وحدت سر وڄن،
وحده لا شريڪ له، اهو راڳ رڳن،
سي ستائي سونهن، ننڊ عبادت ان جي.
سر آسا

وہ جن کا تن تسبیح ہے، من دانے ہیں اور دل تنبورا ہے
جن کی تاریں (رگیں) وحدت کے سوز میں بج رہی ہیں
وحدہ لاشریک لہ یہی رگوں کا راگ ہے، ایسے لوگ سوئے ہوئے ہی سہانے لگتے ہیں، کیونکہ نیند ان کی عبادت ہے۔

(٨)

رات سهائي، پون سنين، پٽئين وڏو پنڌ،
هلندي حبيبن ڏي، ڪرها موڙ م ڪنڌ،
ٻنڌڻ سو ئي ٻنڌ، جو پهچائي پرين ڪي.
سر ڪنيات

Marfat.com

چاندنی رات ہموار میدان اور بڑی دور منزلیں
اے میرے اونٹ (ایسی حالت میں) محبوب کی طرف چلتے ہوئے اپنا سر نہ موڑ
(یعنی تیز چل)
ایسا پختہ ارادہ کر لے جو ضرور محبوب تک پہنچائے

(۹)

ڪرها ڪسر ڇڏ، وک وڌندڙ پاءِ
منهنجو هلڻ اتهين، جتي جانب جاءِ
توکي چندن چاريان، بيو وڳ لاٽي کاءِ
ايهين اُٺ اُناءِ، جئن هونديءَ رات هُت مڙون.
سر ڪنيات

اے میرے اونٹ! رفتار کم نہ کر، قدم آگے اٹھا
مجھے اس مقام پر پہنچا دے، جہاں میرا محبوب ہے
میں تجھے چندن (شیرین چیز) کھلاؤں گا، باقی دوسرے کڑوی کسیلی چیزیں کھاتے رہیں
اے اونٹ! مجھے اتنا جلدی لے چل کہ شب باقی ہو اور ہم منزل پر پہنچ جائیں۔

(۱۰)

ڪسر ڇڏ ڪنوات، وکون وجهه وڌنديون،
سنئين سپرين جي، ونگي ياڻءِ مر واٽ،
ڇڏ جهوري ڏي جهات، تہ هونديءَ رات هُت مڙون.
سر ڪنيات

آہستگی چھوڑ دے اے جواں اونٹ اور قدم آگے بڑھا
محبوب کی طرف جانے والی راہ سیدھی ہے، اس میں کوئی کجی نہیں
تو تغافل اور سستی کو چھوڑ کر چھلانگ لگاتا چل! تا کہ شب باقی ہو اور ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں

Marfat.com

(١١)

اُٺ نہ وڃي وڳ سين، چري نہ چانگو،
لڳيس نائڪ نينهن جي، نهوڙيو نانگو،
ڇڏي سر سانگو، رڙهي رند پرين جي.
سر کنيات

اب یہ اونٹ بگلوں کی قطار کے ساتھ چلنا نہیں چاہتا
اس کو ایسا درد عشق لاحق ہوا کہ یہ مضمحل ہو گیا
پھر بھی بلاچون وچرا محبوب کی طرف چل رہا ہے، اگرچہ آہستہ چل رہا ہے

(١٢)

ڪرهي ڪي ڪيئن، وڌم پيند پلڻ جا،
ليڙو لاٽي ڪي چري، نير ساڻ سنئين،
چانگي سندي چت ۾، صاحب وجهہ سنئين،
اوباهيوس اڻين، لطف ساڻ، لطيف چئي.
سر کنيات

میں نے اس اونٹ کو کئی بار رسیاں ڈالکر اس کے پاؤں باندھے (روکے رکھا)
پھر بھی یہ اونٹ صبح ہوتے ہی کڑوی جھاڑیاں کھاتا ہے
یا اللہ! اس اونٹ کے من میں سیدھی راہ چلنے کی بات ڈال۔
یا اللہ! لطیف کی التجا ہے کہ اپنے کرم سے تو ہی اسے پستی سے بلندی کی طرف لے آ۔

Marfat.com

(۱۳)

املهہ آ ہ ان کي، جي نہ پروڙن مَٽِ،
جت گڏجئي جوهري، ماڻڪ تتهين مَٽَ،
جنين سون سين سَٽِ، تن هٽي ريءَ رد ڪيو.
سر سريراڳ

توسچے موتی کو ایسے لوگوں کے سامنے پیش نہ کر، جو کھرے کھوٹے کی پرکھ نہیں کرسکتے
جب بھی کوئی جوہری مل جائے تو موتیوں کا سودا اس سے کر
جو سونے کے سوداگر ہیں وہ قلعی کو رد کرتے ہیں

(۱۴)

اگهيو ڪائو ڪچ، ماڻڪن موٽ ٿي!
پلئہ پايو سچ، آڇيندي لڄ مران!!
سر سريراڳ

شاہ صاحب فرماتے ہیں
میرا حال یہ ہے کہ کوڑا کرکٹ تو مقبول ہوا، لیکن سچے موتی واپس کردیئے گئے
اب سچ کو دامن میں لئے ہوئے بھی پیش کرنے سے شرماتا ہوں

(۱۵)

جوڳيئڙا جهان ۾، نوري ۽ ناري،
ٻري جن ٻاري، آءُ نہ جيئندي ان ري.
سر رامڪلي

اس جہان میں جوگی (عارف) ایک نوری ہیں دوسرے ناری
جنھوں نے خود کو جلاکر دوسروں کو روشنی دی، میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا

Marfat.com

(١٦)

بک وڏائون بکرئين، جوڳي کندا جُج،
طلب رکن نہ طعام جي، اوتيو پين اُج،
لاھوتين لطيف چئي، من ماري کيو مُج،
سامي جهاڳي سُج، وسيئن کي ويجها ٿيا.
سر رامکلي

ان جوگیوں (عارفوں) نے بھوک کو اپنے دامن میں بھر لیا ہے۔
اب یہ کھا کھر سیر ہوں گے، ان کو کھانے پینے کی تو خواہش ہی نہیں کیونکہ یہ تو پیاس کو بھی بھر کر پیتے ہیں
لطیف فرماتے ہیں کہ ان اللہ والوں نے اپنے آپ کو نیست و نابود کر دیا ہے
اب یہ مسافر بیاباں طے کر کے آبادی کے قریب ہوئے ہیں

(١٧)

ويٺو جٺن وماسئين، حيرت پوءِ م هور،
اونهو جو اڇو وهي، گهڙي تنان ئي گهور،
ڏنيون هڏ م ڏور، گهوريو کپ کسين جو،
سر کارايل

(او ہنس) تو جو بیٹھے بیٹھے سوچ رہا ہے، اس طرح حیرت میں پشیمان نہ ہو، وہ جو صاف عمیق پانی ہے، اس میں جا کر تیر اور گھوم
کنارے پر مت چل، ان غلیظ کناروں کو چھوڑ دے

Marfat.com

(١٨)

ماڻڪ چوڻو جن جو، هنجهه حضوري سي،
چلر ۾ چهنب هڻي، مڇي کين نه اي،
لوڪ نه لکيا تي، جيلانهن پڻن بگهن گڏئا.
سر کارايل

حضوری ہنس وہ ہیں جو موتیوں کو چن کر کھاتے ہیں
اور یہ غلیظ مٹی پانی میں اپنی چونچ نہیں ڈبوتے اور نہ ہی یہ مچھلی کھاتے ہیں
البتہ عوام انہیں نہیں پہچانتے، کیونکہ وہ بگلوں کے ساتھ چل رہے ہیں

(١٩)

ويا مور مري، هنجهه نه هيو هيڪڙو،
وطن ٿيو وري، ڪوڙن ڪانگيرن جو.
سر کارایل.

جو مور تھے، وہ مر گئے، کوئی ہنس بھی اب باقی نہیں رہا
یہ مکان، یہ زمین پھر سے جھوٹے کوؤں کا مسکن بن گیا ہے

(٢٠)

پڙاڏو سو سڏ، ور وائي جو جي لهين،
هئا اڳهر گڏ، پر ٻڌڻ ۾ ٻه ٿئا.
سر یمن کلیاڻ

آواز اور اس کی بازگشت در اصل ایک ہی چیز ہے، اگر تو ہوا کی ماہیت کو سمجھے
یہ اصل میں ایک ہی تھے، لیکن سماعت میں دو محسوس ہوتے ہیں۔

Marfat.com

(٢١)

پتنگ چايين پاڻ کي، ته اچي آگ اجهاءِ،
پچڻ گهڻا پچائيا، تو پچڻ کي پچاءِ،
واقف ٿِي وساءِ، آگ نه ڏجي عام کي.

سر يمن ڪلياڻ

اگر تو پروانہ ہونے کا دعویدار ہے تو آکر آگ کو بجھا
درد عشق نے بہت سوں کو پکایا۔ مگر تو اس پکنے کو پکا
اپنے خاص فہم وادراک سے آگ کو بجھادے، البتہ یہ راز عام کو نہ بتا

(٢٢)

ساري سک سبق، شريعت سندو سهڻي،
طريقتا تکو وهي، حقيقت سندو حق،
معرفت مرڪ، اصل عاشقن جو.

سر سهڻي

او سہنی! اچھی طرح شریعت کا سبق یاد کر
طریقت سے زیادہ تیز بہتا ہے، حقیقت کا حق
جو اصلی عاشق ہیں، ان کو معرفت ہی زیبا ہے

(٢٣)

ٻڏندي ٻوڙن کي، کي هاتڪ هٿ وجهن،
پسو لڄ لطيف چئي، ڪيڏي ڪي ڪکن،
توڙي ڪنڌي ڪن، نات ساڻ وڃڻ سير ۾.

سر سهڻي

ڈوبنے والوں میں سے بعض گھاس کو بھی پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں
لطیف کہتا ہے دیکھو ان تنکوں میں کتنی اخلاقی بلندی ہے
یا تو وہ ڈوبنے والوں کو کنارے تک پہنچاتے ہیں یا پھر عمیق دریا میں ان کے ساتھ
جاتے ہیں

Marfat.com

(٢٤)

سڪي جان ستياسِ، تان سڪ سمهڻ نہ ڏئي،
جاڳي ستين جن لاءِ، سي آيا تان نہ اُٿياس،
پينر آءُ پلياس، نات سڪ سمهڻ ڇا لڳي!
سر سسئي

میں اپنے پنھوں (محبوب) کیلئے تڑپ تڑپ کر روئی، اس کی محبت کی یاد نے سونے نہیں دیا
میں جاگ جاگ کر جن کیلئے سوئی، وہ آئے تو میں نہ اٹھی
میں گمراہ ہوئی، یادِ محبت اور نیند دونوں کیسے یکجا ہوسکتے ہیں۔ (ان کا جوڑ کیسے ہوسکتا ہے)

(٢٥)

الا، ائين مَ هوءِ، جيئن آن مران بند ۾،
جسو زنجيرن ۾ راتو ڏينهان روءِ
پهرين وڃان لوءِ، پوءِ مر پڄنم ڏينهڙا.
سر مارئي

یا اللہ! ایسا نہ ہو کہ میں قید و بند کی حالت میں مرجاؤں، یعنی اس طرح مروں کہ میرا جسم زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو اور میں رات دن گریے کی حالت میں ہوں
پہلے میں اپنے وطن جاؤں، اس کے بعد میرے دن ختم ہوجائیں تو ہوجائیں

Marfat.com

(٢٦)

اتان اوني آئيو، خبر اي کري
وسارج ۾ ور کي، پئج ۾ منڌمري،
ويندئي ات وري، کو ڏينهن آهين ڪوٽ ۾.
سر مارئي

میرے وطن سے قاصد یہ خوشخبری لایا ہے کہ اپنے خاوند کو مت بھولنا اور اس طرح مرنہ جانا
تم تو یقینی طور وہاں (وطن) جاؤگی، چند روز ہی اس قلعہ میں بند ہو
وہی دن سہانے تھے، جو میں نے قید و بند میں کاٹے

(٢٧)

سکر سي ئي ڏينهن، جي مون گهاريا بند ۾،
وسايم وڏ ڦڙا، متي ماڙين مينهن،
نير منهنجو نينهن، اجاري اڇو ڪئو.
سر مارئي

میں نے ان محلات میں اپنے گریے سے آنسوؤں کی برسات برسائی
میری بے پناہ محبت نے پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیروں کو نکھار کر صاف کیا

Marfat.com

(٢٨)

موٽي مانداٽن جي، واريءَ ڪيائين وار،
وڄون وسڻ آئيون، چڳيءَ پَت چوڏار
ڪي اٿيون استنبول ڏي، ڪي مڙيون مغرب پار،
ڪي چمڪن چين تي، ڪي لهن سمرقند سار،
ڪي رمي ويئون روم تي، ڪي ڪابل،ڪي قنڌار،
ڪي دهلي، ڪي دکن، ڪي گڙن مٿي گرنار،
ڪي جنبي جيسلمير تان، ڏنا بيڪانير بڪار،
ڪنهين ڀڄ ڀڄائيو، ڪنهين ڍٽ مٿانهين ڍار،
ڪنهين اچي عمرڪوٽ تان، وسايا ولهار،
سائيم! سدائين ڪرين، مٿي سنڌسڪار،
دوست مٺا دلدار، عالم سڀ آباد ڪرين.

سر سارنگ

پھر سے بادل بار بار آئے ہیں
گرج چمک ہر طرف سے ہوئی اور برسات برسی
یہ گرج چمک کہاں سے اٹھی؟ بعض استنبول پر برسیں
بعض نے مغرب کا رخ کیا، بعض چین پر چمکیں اور بعض سمرقند پہنچیں
بعض روم کو گئیں اور بعض کابل اور قندھار پر پڑیں
بعض دہلی پر، بعض دکن پر، بعض گرنا پر گرجیں
بعض جیسلمیر پر پلٹیں، بعض بیکانیر بکار کو پہنچیں
بعض نے بجھ (کچھ) کو تر کیا اور بعض ڈٹ (تھر) پر برسیں
بعض نے عمر کوٹ سے ہوتے ہوئے ولہار کو برسایا
یا اللہ! سندھ کو ہمیشہ کیلئے سرسبز و شاداب رکھ
اے محبوب! سارے عالم کو آباد رکھ

(۲۹)

اندر جهڙ جهور وهي، ٻهر ڪڪر نه ڪو ڪوءِ،
وسائيندي وڄڙي، حُب جنهين کي هوءِ،
لالن جنين لوءِ، سي اوڪاڻين نه اکيون.

سر سارنگ

میرے اندر میں تو بادل برس رہے ہیں، حالانکہ باہر تو کچھ بھی نہیں
گرج چمک ان پر برسے گی جو محبت والے ہیں
محبوب جن کے ہاں نہیں، ان کی آنکھیں برسنا بند ہی نہیں کرتیں

(۳۰)

سيوئو جن سبحان، وير نه وڙهي تن سين،
توبهه جي تاثير سين، تري ويا طوفان،
ڏيئي توڪل تڪيو، آرُ لنگهيا آسان،
ڪامل ڪشتيبان، وچ ۾ گڏين واهرو.

سر سريراڳ

جنہوں نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی پرستش کی، ان کو نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں۔
وہ توبہ کی تاثیر سے طوفان میں سے تیر کر آگے نکل گئے
وہ توکل کے سہارے پُرخطر دریاء کو بھی پار کر گئے
ان کو کامل کشتیباں (کامل مرشد) درمیان میں آکر ملے، جنہوں نے ان کی مدد کی

Marfat.com

(٣١)

پيڙيا تابئي، تو نہ ڦہنديون ڳالهڙيون،
سڄيون راتيون سمهين، پر سُکاڻ ڏيئي،
صباح سيئي، پار پڇندءِ خبرون.
سر سريراڳ

او کشتیباں تمہیں دونوں چیزیں میسر نہیں ہونگی۔
ایک یہ کہ ساری رات سوجانا دوسرے پتوار سے پیٹھ لگا کر سوجانا
کل تم سے ہر چیز کا حساب کتاب لیا جائے گا

(٣٢)

ڪچ ڪمايم ڪوڙ، ڀڳم عهد الله جا،
پڃرو جو پاپن جو، سو چوٽيءَ تان چور،
معلوم اٿئي مذڪور، ڳوڙها انهيءَ ڳالهه جو.
سر سريراڳ

میں نے لایعنی کام کئے اور میں نے اللہ کے حکم توڑے
یہ میرے جسم کا پنجرہ اوپر سے نیچے تک گناہوں سے چکنا چور ہوگیا
یا اللہ! اس حال کا (راز) تو ہی سمجھتا ہے

Marfat.com

(۳۳)

هيٺ جر، مٿي ميڇر، ڪنڌي ڪونهر ترن،
ورئي واهوندن، ڪينجهر ڪتوري ٿئي.
سر ڪاموڏ

نیچے پانی اوپر گل کاری اور کنارے پر پھول تیر رہے ہیں
بہار کی ہوا کی آمد سے کینجھر (جھیل) کستوری بن جاتی ہے

# علامہ آئی آئی قاضی کی کتاب (مشاہدۂ حق) حکیم محمد سعید صاحب کی نظر میں

بیت الحکمہ

Hamdard University Library • Centre for Academic Research • Translation Bureau • Centre for Higher Education

Bait al-Hikmah

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۴۔ ربیع الاول ۱۴۱۸ ہجری

حوالہ نمبر: ب ر ح ر ۹۷ ر ۸۷ — 30۔ جولائی 1997 عیسوی

عزیز محترم جناب محمد موسیٰ بھٹو صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ تعالیٰ و برکاتہ

"مشاہدۂ حق" ـــــ علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی کی تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ جو آپ نے مرتب فرمایا ہے مجھے دو نسخے مل گئے ہیں۔ میں ممنون ہوں۔

علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی سرزمین سندھ سے سربلند کرنے والی ایک نہایت بلند و بالا شخصیت ہیں۔ ان کا فلسفہ حیات زیادہ توجہ عوام و خواص کی گرفت سے باہر رہا اور ان کی عظمت کی شناخت اس وقت ہوئی کہ وہ اذیتوں کو برداشت کرتے ہوئے جدا ہوگئے اور ان کی رفعت کی پہچان اس وقت ہوئی کہ سندھ بہ حیثیت صوبہ فکری مراتب کے استحکام کی جدوجہد میں تھک چکا تھا۔ مستزاد یہ کہ علامہ آئی آئی قاضی کے فکر و نظر قومی زبان اردو کی دست برس سے باہر رہے۔ انگریزی کی فہم محدود تھی۔ اہل سندھ نے قاضی کے فلسفیانہ بیان و کلام کو تعصبات علمی کی نذر کردیا۔

علامہ آئی۔ آئی قاضی متعدد اور مختلف جہتوں میں فکر کرتے تھے' بہ ایں ہمہ فکر اسلامی ان کی فکری و ذہنی گرفت سے ماورا نہیں رہی۔ وہ اسلام کو عالمی تناظر میں دیکھتے تھے اور عصری تقاضوں کو نظرانداز کرنے کو تیار نہ تھے۔ "اسلام کا پیغام اور فلسفہ" معاشرہ شاہ ولی اللہ کی نظر میں' ایمان اور فلسفہ' پیغمبر اسلام ﷺ' فلسفہ' سائنس اور اسلام چند موضوعات ہیں جن پر علامہ آئی آئی قاضی نے نہایت فلسفیانہ انداز سے لکھا ہے اور بولا ہے۔

جناب محترم موسے بھٹو صاحب یقیناً واجب الاحترام ہیں کہ انہوں نے علامہ کے مقالات اور تقاریر کو جامۂ اردو پہنایا ہے اور ایک پختہ ایمان مسلمان کی حیثیت سے خیالات و افکار علامہ کو روشنیاں دی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں مضامین قاضی کا پوری صحت کے ساتھ انتخاب کیا گیا ہے اور اہتمام کیا گیا ہے کہ علامہ کے نظریات و افکار کو جامعیت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ محبت اور کشش کا قانون' مذہب اور قانون' قوموں کے عروج و زوال میں کتاب کی اہمیت' خلفا کے دور میں جمہوریت وغیرہ مقالات فکر و فہم کے لیے راہوں کو روشن کرتے ہیں۔ دو سو صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ پوری اہمیت کا حامل ہے اور ہر اس انسان کے مطالعہ کے لائق ہے کہ جو فکر کو توانائیاں دے کر تعمیر کے میدان میں برسر عمل ہونا چاہتے ہیں۔

پیش لفظ پڑھ اندازہ ہوتا کہ جناب محمد موسیٰ بھٹو صاحب کو زبان اردو پر کس قدر اچھا عبور ہے۔

آپ کا مخلص

حکیم محمد سعید

بگرامی خدمت جناب محترم محمد موسیٰ بھٹو صاحب

علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی یادگار سوسائٹی'

حیدر آباد سندھ۔

Marfat.com

# تعارف

علامہ آئی آئی قاضی سندھ کے مشہور علمی قصبے پاٹ (ضلع دادو) میں ۹ اپریل ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد میاں امام علی صاحب اس وقت جج تھے. ملازمت کی خاطر انہوں نے حیدر آباد میں رہائش اختیار کرلی تھی. موصوف نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک عالم میاں آخوند عبدالعزیز کی خدمات حاصل کرلی تھی. علامہ نے قرآن اور فارسی کی تعلیم آخوند صاحب سے حاصل کی. علامہ صاحب کی بہتر تربیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے سات سال کی عمر سے پانچ وقت نماز کے ساتھ ساتھ تہجد بھی شروع کی تھی، وہ گیارہ سال کی عمر میں نقشبندی سلسلہ میں شامل ہوئے اور پاٹ کے ایک صدیقی خاندان کے بزرگ سے قلبی ذکر کا سبق لیا، اس طرح ان کے مراقبوں اور اپنے اندر میں غوطہ زنی کا سلسلہ ۱۱ سال کی عمر سے شروع ہوا.

علامہ صاحب ۱۹۰۴ء میں جدید تعلیم کیلئے سندھ مدرستہ الاسلام کراچی میں داخل ہوئے ۱۹۰۵ء میں بمبئی یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے، ۱۹۰۷ء میں مزید تعلیم کے حصول کیلئے انگلینڈ گئے، وہاں "لندن سکول آف اکنامکس" میں داخل ہوئے، ۱۹۱۱ء میں موصوف نے جرمنی سے "بار ایٹ لا" کی ڈگری حاصل کی، اسی سال وہیں علامہ کی ایک جرمن خاتون مدر ایلسا سے شادی ہوئی، لندن میں دوران قیام علامہ کی علمی خدمات اور ذہانت کی وجہ سے انہیں ۱۹۲۹ء میں انگلینڈ کی "فلاسافیکل سوسائٹی" کا تاحیات ممبر مقرر کیا گیا ۱۹۲۴ء میں مشاعراتی سوسائٹی کا نائب صدر نامزد کیا گیا، لندن میں دوران قیام علامہ نے مسلمانوں کی تربیت اور اسلامی دعوت کے فروغ کے لیے "جمعیتہ المسلمین" کے نام سے ایک جماعت کی تشکیل کی اور ایسٹ انڈیا میں ایک مسجد بھی قائم کی، جہاں وہ خطبات کے ذریعہ ا

علامہ کچھ وقت کے لیے خیرپور،

یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے، ۱۹۵۸ء تک

۱۹۶۸ء کو انتقال ہوا.

297.04 ق 32 ع
*76663-U-67*

# عرفان حق

(علامہ آئی آئی قاضی کی تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ)

مرتب:

محمد موسیٰ بھٹو

علامہ آئی آئی قاضی یادگار سوسائٹی
حیدرآباد سندھ پاکستان

۱۴۲۱ھ/۱۹۹۹ء

Marfat.com